پہلی بار	نومبر ۱۹۵۷ء
تعداد	ایک ہزار
ناشر	مکتبہ برہان، اردو بازار۔ دہلی
کاتب	محمد شفیع دہلوی
طابع	اعلیٰ پریس دہلی
سرورق	اندرجیت آرٹسٹ
ضخامت	۱۹۲ صفحے

قیمت

دو روپے پچاس نئے پیسے

۲/۸

میرؔ کی آپ بیتی

میر محمد تقی میرؔ کی خود نوشت سوانح عمری "ذکرِ میر"
کا اُردو ترجمہ، ضروری حواشی اور تعلیقات کے ساتھ

مرتّبہ

نثار احمد فاروقی

مکتبہ بُرہان، اُردو بازار، دلی ۶

○ مصنّف

نام	میر تقی میر
مولد	آگرہ (اکبر آباد)
پیدائش	۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء
وفات	جمعہ، ۲۰ر شعبان ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء
مدفن	لکھنؤ
تصانیف	(۱) چھ دیوان اُردو مع مثنویات وقصائد و مخمّس و رباعیات وغیرہ۔ (۷) دیوان فارسی (۸) ذکرِ میر (۹) فیضِ میر (۱۰) نکات الشعرا۔ (۱۱) دریائے عشق (نثر) نایاب۔

○ مرتّب

نام	نثار احمد فاروقی
مولد	امروہہ، ضلع مراد آباد
پیدائش	جمعہ، ۲۹ر جون ۱۹۳۴ء
دیگر تصانیف	(۱) مصحفی: تذکرہ، تنقید، انتخاب (زیرِ تکمیل) (۲) ذکرِ غالب (ہندی ترجمہ) زیرِ تکمیل (۳) نکات الشعرا (ترتیب و تحشیہ) زیرِ طبع (۴) دید و دریافت (تنقیدی مضامین) زیرِ طبع

نذر

لایق نہ بود قطرہ بہ عماں بُردن　　خار و خسِ صحرا بہ گلستاں بُردن
لیکن چہ کنم کہ رسم مورے باشد　　پائے ملخے پیشِ سلیماں بُردن

میں اپنی یہ حقیر کوشش، احترام وعقیدت کے سدا بہار پھولوں کی خوشبو میں بسا کر اپنے فاضل استاد اور بزرگ نانا، حضرت مولوی شاہ سلیمان احمدؒ چشتی مدظلہ العالی، کی خدمت میں شرفِ قبول کی تمنا کے ساتھ پیش کرتا ہوں جن کے فیضِ تربیت سے خزف ریزوں کو ایسا آب ورنگ مل گیا کہ وہ لعل و گوہر سے آنکھ ملا سکیں!

گُہ اگر ریزد زتاکِ من اندست
زمزم ار جوشد زخاکِ من اندست

خاک نشین
نثار احمدؒ فاروقی

فہرس

مقدّمہ

میرؔ اُردو شاعری کے "پیمبر" نہیں خدا ہیں۔ اور اُن کی "خدائی" کے حضور ایسے ایسے سرکشوں نے اپنی "بندگی" کا اظہار کیا ہے جن کا مسلک ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں، بلکہ متضاد ہے۔ بھلا ناسخؔ اور غالبؔ اور ذوقؔ میں کوئی وجہِ مشترک خیال میں آسکتی ہے؟ لیکن اس کے باوجود ان تینوں نے میرؔ کی برتری اور استادی کا اعتراف کیا ہے۔ کس کا جی نہیں چاہے گا، کہ اس خدائے سخن کے حالات تفصیل سے معلوم کرے۔ ہماری خوش قسمتی کہ میرؔ نے خود اپنے حالات "ذِکرِ میر" کے عنوان سے فارسی میں لکھ دیے تھے اور حسنِ اتفاق سے یہ کتاب دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئی۔ زیرِ نظر کتاب اُسی خود نوشت سوانح عمری کا اردو ترجمہ ہے۔ چونکہ اصل فارسی نسخہ بھی اب کم یاب ہے، اس لیے اُردو دنیا کو مترجم کا شکر گزار ہونا چاہیے، کہ اُنھوں نے اِسے اُردو میں منتقل کر کے اُس سے استفادے کا حلقہ وسیع تر کر دیا۔

اِس کتاب کی اہمیت دو گونہ ہے۔ ایک انفسی، دوسری آفاقی۔ انفسی یہ، کہ اِس سے میرؔ کے اپنے حالات، جن سے متعلق کسی شبہے کا امکان نہیں، کم و بیش تفصیل سے

معلوم ہو جاتے ہیں۔ میرؔ ۱۱۹۶ھ میں دہلی سے لکھنؤ گئے۔ اُن کی پیدائش غالباً ۱۱۳۶ھ میں ہوئی تھی۔ گویا سفرِ لکھنؤ کے زمانے میں اُن کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ہمارے پاس اِن ساٹھ برس کے حالات کا "ذکرِ میر" سے زیادہ مستند اور کوئی ماخذ نہیں۔

تذکرہ نویسوں نے عام طور پر، اور مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں خاص طور پر جو باتیں میرؔ سے متعلق لکھی ہیں، اُن سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اُن کی اصلاح "ذکرِ میر" سے ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس سے یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کے والد کا نام میر محمد علی تھا۔ اور وہ اپنے زہد و اتقاء کے باعث میر علی متقی کے عرف سے مشہور تھے (ص ۹۱)۔ اِسی سے معلوم ہوا، کہ وہ واقعی سیّد تھے اور جن لوگوں نے اُن کی سیادت پر شبہہ کیا ہے وہ غلطی پر ہیں۔ آزاد نے آبِ حیات میں غالباً خود میرؔ کے ایک بیان (نکات الشعرا، ص ۴) پر بھروسا کر کے انھیں خان آرزو کا شاگرد لکھا ہے، جو اُن کے سوتیلے ماموں بھی ہوتے تھے۔ اِس کتاب سے معلوم ہوا، کہ نہ صرف یہ، کہ وہ اُن کے استاد نہیں تھے۔ بلکہ اُنھوں نے اِن کی تعلیم و تربیت میں کسی طرح کی دل چسپی ہی نہیں لی اور اپنے بھانجے میر محمد حسن (یعنی میرؔ کے سوتیلے بڑے بھائی) کی انگیخت پر اُن سے بہت بدسلوکی کی (ص ۴۹)۔ میرؔ، بلکہ اردو ادب پر بہت بڑا احسان میر سعادت علی امروہوی کا ہے، جن کے کہنے پر میرؔ نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ میر سعادت علی خود بھی شعر کہتے اور سعادت تخلص کرتے تھے۔ اُن کا نام تقریباً تمام تذکروں میں ملتا ہے۔ "ذکرِ میرؔ" کے الفاظ بہت واضح نہیں۔ لیکن پھر بھی ان سے اتنا بآسانی مستنبط ہوتا ہے، کہ میرؔ نے اُن سے مشورہ کیا اور کلام پر اصلاح

لی - (ص ۹۷-۹۸) - بلکہ اسی مقام سے کچھ ایسا خیال گذرتا ہے، کہ غالباً میرؔ اس سے پہلے فارسی میں شعر کہتے تھے۔ آزادؔ نے میرؔ کے سفرِ لکھنؤ کے جو حالات لکھے ہیں، اُن میں داستان کا لُطف ہے۔ لیکن "ذِکرِ میر" دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے، کہ یہ بالکل بے اصل ہیں۔ میرؔ نے لکھنؤ کا سفر خود نوّاب وزیر آصف الدّولہ کی دعوت پر کیا تھا۔ آصف الدّولہ نے سالار جنگ کے ذریعے زادِ راہ بھیج کر اُنھیں بلوایا تھا۔ (ص ۱۷۸-۱۷۹) - یہ وہاں پہنچ کر سالار جنگ کے دولت کدے ہی پر اُترے۔ اب اِس کے بالمقابل آبِ حیات کا متعلّقہ مقام دیکھیے، تو افسانہ و حقیقت کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اِس طرح کی کئی تفصیلات ہیں، جن کی اصلاح "ذِکرِ میرؔ" سے ہوتی ہے۔

میرؔ کے ذاتی حالات کے علاوہ یہ کتاب ہندستان کی اُس دور کی تاریخ کا بھی بہت اچھا ماخذ ہے۔ افسوس، کہ ہمارے مورخوں کا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ یہ بڑا پُر آشوب زمانہ تھا۔ بیرونی حملہ آوروں کی تاخت و تاراج اور اندرونی امیروں کی خانہ جنگی اور پیش قدمی نے سلطنتِ مغلیہ کا حال بہت پتلا کر رکھا تھا۔ بادشاہِ دہلی کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں تھی۔ جو شخص بھی اپنی ذاتی قابلیت اور ریشہ دوانیوں سے یا اپنے حلیفوں کی مدد سے وزارتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو جاتا، دراصل وہی حکمرانِ وقت تھا۔ احمد شاہ درّانی نے یکے بعد دیگرے متعدد حملے کیے۔ یہاں ملک کے اندر افغانوں اور مرہٹوں اور جاٹوں نے وہ اودھم مچا رکھی تھی، کہ خلقِ خدا اُن کے ظلم و ستم سے پناہ مانگتی تھی۔ یہ تمام حالات نہ صرف میرؔ کے سامنے پیش آئے، بلکہ وہ خود اس

"دریائے خون کے شناور" رہے۔ اور کتنے معرکوں میں تو بذاتِ خود موجود تھے۔ اِن خانہ جنگیوں کی بعض تفصیلات جو اُنھوں نے قلم بند کی ہیں، وہ کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں اور ضرورت ہے، کہ اِس پہلو سے اِس کتاب کا مطالعہ غائر نظر سے کیا جائے۔

لیکن اِن باتوں کے علاوہ اس کتاب کی ایک اور خصوصیّت بھی نظرانداز کر دینے کے قابل نہیں۔ اس اخلاقی اور روحانی تعلیم ایسے سادہ اور دل نشین انداز میں بیان کی گئی ہے، کہ اس سے بہتر بہت کم کسی اور جگہ دیکھنے میں آئی۔ اخلاق اور روحانیت کوئی نظری چیز نہیں۔ یہ سراسر عملی حقیقت ہے۔ اگر آپ اِن تعلیمات پر عمل نہیں کرتے، تو اِن کی صرف زبانی تلقین یا اُن پر ذہنی ایمان نہ کافی ہے، نہ مفید۔ میر ایک اہلِ علم و عرفان خاندان کے نام لیوا تھے۔ اُن کے والد میر علی متقّی برگزیدہ درویش اور صاحبِ رُشدو ہدایت صوفی تھے۔ اس لیے اگر وہ اِن مسایل پر گفتگو کریں اور اپنے حلقہ نشینوں کو یا خود میر ہی کو پند و نصیحت کریں، تو اُن پر بے عملی کا الزام نہیں لگ سکتا، کہ کوئی اُن سے کہے "تو بُرون درچہ کردی، کہ درونِ خانہ آئی"۔ یہی سبب ہے، کہ میر کے والد یا چچا نے جو تعلیم انھیں دی، اُس کا لفظ لفظ خلوص سے پُر اور ناخن بدِل ہے۔ چونکہ یہ باتیں دل سے نکلی ہیں، اس لیے دل پر اثر کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کس ماحول میں پیدا ہوئے اور کس پایے کے بزرگوں کی نگرانی میں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اِس سے میر کی زندگی اور اُن کا مزاج اور کلام سمجھنے میں بہت مدد

ملتی ہے۔

اِن اسباب سے میں خیال کرتا ہوں، کہ یہ بہت اچھّا ہوا جو "ذکرِ میر" کا ترجمہ اُردو میں ہو گیا۔ جناب نثار احمدؐ فاروقی نے بحیثیت مترجم اپنا فرض بہت اچھّی طرح نبھایا ہے۔ اُنھوں نے اصل کے مطالب سے کہیں انحراف نہیں کیا۔ ترجمہ کی زبان بھی شگفتہ اور سلیس اور با محاورہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُردو دان طبقہ اِس کتاب سے پورے طور پر مستفید ہو گا۔

مالک رام

نئی دہلی
۳-اکتوبر ۱۹۵۷ء

ابتدائیہ

اُردو میں میر محمد تقی میر کا شاعرانہ مرتبہ تعریف یا تعارف سے بہت بلند ہے، اور اس حیثیت سے اُن کی ادبی اوّلیت مسلّم ہے کہ اُنھوں نے اُردو غزل کو نیا رنگ و آہنگ اور منفرد لب و لہجہ عطا کیا۔ اِس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اُن کا تذکرہ "نکات الشعرا" بھی اُردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اب تک جتنے تذکرے دریافت ہوئے ہیں اُن میں قدیم ترین مانا جاتا ہے۔ اُن سے پہلے اگر کسی نے شعرائے اردو کا کوئی تذکرہ لکھا بھی ہو تو وہ اب محفوظ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ میر اُردو کے پہلے اور غالباً آخری شاعر ہیں جنھوں نے خود اپنی سوانح عمری لکھی اور وہ محفوظ رہ گئی۔

فارسی متن — اصل کتاب فارسی میں ہے، اس کا ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۸ء) کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ خان بہادر مولوی بشیر الدین مرحوم بانی مسلم ہائی اسکول اٹاوہ کو ملا تھا۔ پہلی بار ۱۹۲۶ء میں اُس کا ملخص اردو ترجمہ مولوی عبدالحق نے سہ ماہی "اردو" میں چھاپا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں فارسی متن بھی اپنے مقدمے کے ساتھ شایع کیا۔ یہ ٹائپ میں چھاپا گیا تھا جس میں ۶ صفحے فہرس

کے، ۲۰ مقدمے کے اور ۱۵۳ متن کے ہیں۔ اِس میں طباعت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ اور ترتیب کے نقائص سے بھی خالی نہیں۔

نسخۂ لاہور

ذِکرِ میر کے تین قلمی نسخے اب تک دریافت ہوئے ہیں۔ ایک تو یہی اٹاوے کا، دوسرا نسخۂ لاہور، جو پروفیسر محمد شفیع کی ملکیت ہے یہ مطبوعہ متن کی تصحیح کے وقت مولوی عبدالحق کے پیشِ نظر رہا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اُس کے اختلافات کا اچھی طرح مقابلہ نہیں کیا۔ پروفیسر محمد شفیع کا یہ نسخہ ۲۶ ربیع الاوّل ۱۲۳۱ھ مطابق ۲۷ فروری ۱۸۱۶ء یعنی سنہ جلوس اکبر ثانی کا لکھا ہوا ہے۔ نسخہ اٹاوہ میں جس پر مطبوعہ متن مبنی ہے، میر نے خاتمے میں اپنی عمر ۶۰ سال لکھی ہے لیکن نسخۂ لاہور میں اُس کی جگہ ۵۰ سال ہے اور مطبوعہ فارسی متن کے صفحہ ۱۲۸ (ترجمہ ہذا کے صفحہ ۱۶۷) میں جہاں:

ایں شامتِ اعمال قیامت بسر آورد

آیا ہے نسخۂ لاہور میں اُس کے بعد یہ عبارت ملتی ہے:

"آنچہ از اسلوب معلوم می شود، حسام الدین خاں در اصل از میاں رفت، چراکہ بدستِ دشمنانِ جانی افتادہ است، تا بعقد در زندہ نخواہند گزاشت۔"

پھر خاتمے کی عبارت اور قطعہ تاریخ ہے اور چند لطیفے دیے ہیں، جن کے بارے میں مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ فحش ہیں اس لیے طباعت کے وقت کتاب سے خارج کر دیے گئے۔

نسخۂ رام پور

ذِکرِ میر کا دوسرا خطّی نسخہ کتاب خانہ عالیہ رام پور میں محفوظ ہے، جو رمضان ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) کا مکتوبہ ہے اِسے شیخ لطف علی حیدری نے نقل کیا ہے اور اُس میں:

ایں شامتِ اعمال نیاست بسر آورد

کے بعد یہ عبارت ہے:

"آنچہ ظاہر است حسام الدین خاں درحقیقت از میاں رفت چرا کہ بدستِ دشمنانِ جانی افتادہ است تا مقدور زندہ نخواہند گزاشت۔ بیشتر اختیار خدا است کہ او بر ہمہ چیز قادر است۔"

رام پور کے نسخے میں کتاب کا اختتام میرؔ نے اپنی عسرت اور تنگ دستی کے دل دوز بیان پر کیا ہے جو نہ اٹاوے کے نسخے میں ہے نہ لاہور کے۔ وہ عبارت یہ ہے:

"احوالِ فقیر از سہ سال آں کہ چوں قدر دانے درمیاں نیست و عرصۂ روزگار بسیار تنگ است توکّل بخدائے کریم کہ او رزّاقِ ذی القوۃِ المتین است، کردہ بخانہ نشستہ ام ظاہر از اسباب باعزّۃ چند مثل ابوالقاسم خاں برادرِ خورد عبدالاحد خاں مجدالدولہ و وجیہ الدین خاں برادرِ حسام الدین خاں و بیرم خاں صاحب خلف الصدق بہرام خاں کلاں کہ در آدمی روشی یکتائے روزگار خود اند و قطب الدین خاں پسر سعدالدین خاں خانساماں، اگرچہ سنّش کم است ..... و خالی از سعادت مندی نیست و قاضی لطف علی خاں کہ آدمیانہ می زید گاہ گاہ ملاقات کردہ می آید خواہ از دستِ ایشاں انتفاعے رسد یا نرسد۔ مایۂ توکّل ہمیں صاحباں اند و گاہے ایں چنیں ہم اتفاق می شود کہ کسے فقیر و شاعر و متوکّل دانستہ بطریقِ نذر۔ چیزے می فرستد محلِّ شکر است۔ اکثر قرض دار می باشم و بہ عسرتِ تمام بسر می کنم۔"

نسخۂ رام پور کے خاتمے میں بھی مطبوعہ نسخے کے برخلاف اور نسخۂ لاہور کے مطابق میرؔ نے

اپنی عمر ۹۰ سال لکھی ہے۔ ۱۱۳۵ھ اُن کا سالِ ولادت تسلیم کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا یہ احوال اُنھوں نے ۱۱۸۵ھ کے بعد لکھا ہے۔ اگر یہ اضافہ اُنھوں نے لکھنؤ میں کیا ہے تو اِس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دربارِ اودھ سے وابستہ ہونے کے بعد بھی میر کی تنگ دستی اور افلاس کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ اٹاوے کا نسخہ میر کی زندگی میں نقل ہوا ہے اور نسخۂ رام پور ۱۲۴۶ھ میں یعنی میر کی وفات سے تقریباً ۲۱ برس کے بعد لکھا گیا اس سے یہی قیاس ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا عبارت میر نے لکھنؤ کے قیام میں بڑھائی ہوگی۔ ورنہ ۱۲۲۲ھ کا نسخہ اُس سے خالی نہ ہوتا۔

زمانۂ تصنیف

ذکرِ میر کی تصنیف کا آغاز کب ہوا، اس بارے میں کوئی قطعی رائے قایم نہیں کی جا سکتی، میرا اپنا خیال ہے کہ میر نے اُسے ۱۱۸۵ھ سے بہت پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا، اور آخر عمر تک اس میں اضافہ و ترمیم کرتے رہے۔ لیکن مخدومی قاضی عبدالودود صاحب (بیرسٹرایٹ لا، پٹنہ) فرماتے ہیں کہ کتاب ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ لکھنا شروع کی گئی۔ میر نے اس کے اختتام کی تاریخ اِس قطعے سے نکالی ہے:

مسمّٰی باسمی شد ای باہنر
کہ ایں نسخہ گردد بعالم سمر
زتاریخ آگہ شوی بے گماں
فزاؤ عدد بست و ہفت ار براں

کتاب کے نام ’ذکرِ میر‘ سے ۱۱۷۰ھ نکلتے ہیں جس میں ۲۷ جمع کرنے سے ۱۱۹۷ھ حاصل ہوں گے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب میں اس سنہ کے بعد کے واقعات بھی درج ہیں یعنی غلام قادر روہیلہ کے مظالم کا بیان جو ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸ء) کا واقعہ ہے۔ مخدومی قاضی عبدالودود صاحب فرماتے ہیں:

"..... میرا قیاس ہے کہ یہ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں شروع ہوئی۔ نسخۂ لاہور کا انجام بظاہر

۱۱۸۷ھ (۷۳-۱۷۷۲ء) میں اور نسخۂ اتاوہ ظاہرا ۱۲۰۳ھ (۸۹-۱۷۸۸ء) میں تمام ہوا' آغازِ کتاب کے بارے میں میرا قیاس صحیح ہے تو کتاب کا بیشتر حصّہ (نسخۂ مطبوعہ میں صفحہ ا سے صفحہ ۱۲۰ تک) کامان میں قلم بند ہوا ہے محض چند صفحے (صفحہ ۱۲۱ سے ۱۲۸ سطر ۴) دہلی میں اور باقی لکھنؤ میں .....“

واقعات کی کیفیت

اس کتاب میں ابتدائی حصّہ میر کے والد اور منھ بولے چچا کی تعریفوں اور مسائلِ تصوف سے بھرا ہوا ہے اس میں نہایت شاعرانہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے میر کے والد یا ”چچا“ امان اللہ اتنے بڑے صوفی اور بزرگ نہ تھے کہ ”خلقِ خدا اُن کے آستانے کی خاک بطور تبرک“ لے جاتی یا وہ آسمانِ درویشی کے آفتاب و ماہتاب ہوں' اس میں میر نے جی کھول کر مبالغے سے کام لیا ہے۔

میر کو اپنے باپ اور چچا کا سایہ ۱۱-۱۲ برس سے زیادہ نصیب نہیں ہوا۔ لیکن اُنھوں نے میر امان اللہ کے ساتھ بعض درویشوں کی صحبت میں جانے کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کے اقوال و اشعار نقل کیے ہیں مگر جن دنوں کی یہ باتیں ہیں اُس وقت میر کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں تھی، پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ اتنا کم سن بچّہ درویشوں کے صوفیانہ اقوال کو اس طرح سمجھ سکے کہ تقریباً تیس، چالیس سال کے بعد جب وہ اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھے تو اُنھیں مِن و عن نقل کر دے میرا اپنا خیال ہے کہ یہ سارے واقعات میر کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں ممکن ہے کہ خارج میں احسان اللہ اور بایزید وغیرہ کا وجود رہا ہو لیکن اُن سے جو ملفوظات روایت کیے گئے ہیں اُن کا بیشتر حصّہ جعلی اور اختراعی ہے' یہ شبہ یقین کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک فقیر احسان اللہ کی خدمت میں اپنے چچا کے ساتھ جانے کا حال لکھا ہے۔ یہ اس درویش سے اُن کی آخری ملاقات تھی۔ اُس دن شام کو نصرت یار خاں صوبہ دار آگرہ آکر قدم بوس ہوا' اور پانچ اشرفیاں نذر کرکے چلا گیا وغیرہ۔ قطعِ نظر اس سے کہ نصرت یار خاں کے صوبہ دار آگرہ بننے

کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں، اُس کی تاریخ وفات جیسا کہ ہم نے ترجمے کے حاشیے میں لکھ دیا ہے ۱۱۳۴ھ ہے اور میر اُس کی وفات سے بھی ایک سال کے بعد پیدا ہوئے ہیں اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ میر سے نام لکھنے میں سہو ہوا ہے تب بھی یہ باتیں زیادہ قابلِ قبول نہیں۔

کتاب کا جو حصّہ امیر الامرا صمصام الدولہ کے دربار سے وظیفہ مقرّر ہونے اور اُس کے بعد کے حالات وحادثات سے متعلق ہے وہ البتہ تاریخی حقائق ہیں اور دوسری تاریخوں سے زیادہ مستند سمجھے جا سکتے ہیں۔

ادبی حیثیت

مولوی عبدالحق نے میر کی فارسی کی تعریف کی ہے اور اُن کی نثر کو سادہ وشیریں بتایا ہے، یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا ابتدائی حصّہ میر نے خاصی محنت سے لکھا ہے اور اُس دور کے "مرزایانِ ایران" کی نقل کے شوق میں عبارت کو اتنا ادق بنا دیا ہے کہ بعض الفاظ کی تشریح خود اُنھیں حاشیے پر لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میر نے اپنے "چچا" کی وفات سے قبل اسداللہ کے دکبود جامہ، سے آنے کا تذکرہ کیا ہے، 'دکبود جامہ، کے بارے میں صرف "چراغِ ہدایت" سے یہ علم ہوا کہ ایک شہر کا نام ہے لیکن نہایت تلاش وتحقیق کے بعد بھی اُس کا جغرافیہ معلوم نہ ہو سکا۔ 'ذکرِ میر، کے الفاظ اور محاورے چراغِ ہدایت کے سوا کسی دوسری لغت میں مشکل ہی سے ملتے ہیں۔

'ذکرِ میر، سے متعلق بہت سے گوشے ایسے ہیں جن پر تفصیل سے بحث کی جا سکتی ہے لیکن میں نے اُسے یہاں قصداً قلم انداز کر دیا ہے پھر کبھی علیحدہ مضمون کی شکل میں پیش کروں گا۔ انشاءاللہ

ترجمے کی کیفیت

اب چند باتیں اِس ترجمے کے متعلق عرض کر دوں، اسے میں نے ۱۹۵۱ء کے اواخر میں شروع کیا تھا اور یہ ۱۹۵۲ء میں ختم ہوا، اس کے بعد گاہے گاہے اس پر نظر ثانی کرتا رہا، پہلے یہ آزاد ترجمے کی شکل میں لکھا گیا تھا لیکن محترمی ومخدومی

حضرت مالک رام کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے اُس پر دوبارہ محنت کی۔ اَب کی بار اسے لفظی ترجے میں منتقل کرنے کی کوشش کی اور لگے ہاتھوں چند ضروری حواشی بھی لکھ دیے۔ لیکن اب بھی مجموعی طور سے یہ کام جیسا میں چاہتا تھا ویسا نہیں ہے۔ اس میں بعض خامیاں رہ گئی ہیں جن کا مجھے احساس ہے، لیکن اُن کی تلافی اِس وقت ممکن نہ تھی جب کہ کتاب کتابت کے مرحلوں سے چند بار گزر چکی ہے۔

شکریے

یہ ایک قدیم رسم ہے کہ کتاب کے سلسلے میں جن لوگوں سے مدد ملی ہو، اُن کا شکریہ ادا کیا جائے، مگر میں یہ سطور اس رسم کی پیروی میں نہیں لکھ رہا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ یہ بُری بھلی جیسی کوشش بھی ہے، میں اس کا اہل نہیں تھا۔ اگر میرے بعض بزرگوں اور دوستوں کی ہدایتیں اور مشورے شریک نہ ہوتے۔

مخدومی و مکرمی حضرت مالک رام نے کتاب کے ابتدائی نصف حصّے پر بڑی توجہ سے نظرِ ثانی فرمائی اور نہایت گراں قدر مشورے دیے۔ پھر اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر نہایت جامع مقدمہ لکھا — یوں بھی وہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے ہیں، میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور محض شکریے کے چند الفاظ سے اُن کی عنایتوں کے حقوق ادا نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح مخدومی مولانا امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتاب خانہ عالیہ رامپور، اور مخدومی قاضی عبدالودود صاحب (بیرسٹر ایٹ لا۔ پٹنہ) نیز حضرت نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے احسانات سے بھی میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتا کہ یہ بزرگ "بُعدِ منزل" کے باوجود خط و کتابت کے ذریعے مجھے ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے ہیں۔ اِس کتاب میں اگر کوئی خوبی ہو تو انھیں حضرات کا فیض ہے اور خامیاں میری اپنی ہیں۔

احباب میں جناب شاہد علی خاں دلی شکریے کے حق دار ہیں، انھوں نے ابتدا سے کتاب کی طباعت میں گہری دل چسپی لی اگر اُن کی توجہ نہ ہوتی تو شاید یہ کتاب ابھی اور تاخیر سے شایع ہوتی۔

میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا بھی تہِ دل سے سپاس گزار ہوں کہ اُنھوں نے سنجیدہ علمی کتابوں کی ناقدری کے اِس دَور میں اِس کی اشاعت کا سر و سامان کیا۔ میرے دوست اور مشہور حُسن کار جناب اندرجیت نے کتاب کا سادہ و دلکش سرورق بنایا، اور جناب محمد شفیع دہلوی نے دل چسپی سے کتابت کی ہے ان دونوں حضرات کا بھی ممنون ہوں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

نثار احمد فاروقی

۱۸؍اکتوبر ۱۹۵۷ء

یونیورسٹی لائبریری۔ دہلی۔ ۸

میرؔ کی آپ بیتی

(ذکرِ میر کا اُردو ترجمہ)

خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا، شعور سے وہ!

(میر محمد تقی میرؔ علیہ الرحمۃ)

دیباچہ

حمد بے حد تعریف اُس سخن درِ یکتا کی، جس کی یکتائی کا شاہ بیت سارے عالم میں مشہور ہوا، اور بے حساب حمد اُس صنعت گر کی، جس نے معانی کے موتیوں کو نظم و نثر کی لڑی میں پرو دیا۔ وہ ایسا قادرِ سخن ہے کہ زبانوں کو کلام کے ہزار رنگ سے آشنا کرتا ہے، ایسا معلّم ہے کہ ہر انسان کو، جو بات کرنے سے عاجز ہے، زبان دیتا ہے؛ ایسا پیدا کرنے والا، کہ تمام مخلوقات کو نوازتا ہے؛ ایسا صانع کہ خاک کو انسان بنا دیتا ہے؛ ایسا پالن ہار ہے کہ اُس کا لطف شریکِ حال نہ ہو تو ہماری سلامتی محال ہے؛ ایسا فن کار ہے کہ اُس کی نقل اڑانے کا کسی کو یارا نہیں، ایسا علیم ہے کہ اُس کے دائرۂ علم میں تمام مرکب اور بسیط اشیاء کا علم سمایا ہوا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے اِنّ اللّٰہَ علیٰ کُلِّ شَیئٍ مُحیط، (یقیناً خدا تمام چیزوں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے)۔ وہ ایسا حکمت والا ہے جو تمام رازوں کو جانتا ہے۔ وہ قدیم ہے اور ہستی صرف اُسی کی ہستی ہے، وہ رزاق ہے، رزق دیتا ہے، مالک ہے، زندگی بخشتا ہے، رحیم ہے گنہ گاروں کی توبہ قبول کرتا ہے، کریم ہے کہ عطائیں کرتا اور خطائیں ڈھکتا ہے۔ سورج اُس کے ظہور کا ایک ذرہ ہے، اور چاند اُس کے نور کا ایک شمّہ۔ کوئی شَے اُس کے نور سے عاری نہیں، مختصر یہ کہ "اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے" —— چوں کہ اُس کا ناز نیازمندی کو پسند کرتا ہے اس لیے جو سر جھکاتا ہے

وہ اُسے نا اُمید نہیں کرتا۔ وہ پیدا کرنے والا ہے اور سب کچھ اُسی نے پیدا کیا ہے، وہ دیکھنے والا ہے، اور تمام ڈھکی چھپی باتوں کو دیکھتا ہے۔ اگرچہ فلکِ کج رفتار مجھ سے کج بازی کرتا ہے لیکن خدا سے اُمید ہے کہ وہ مجھے بے آبرو نہ ہونے دے گا۔ کون سی زبان ہے جو اُس کا نام نہیں جپتی اور کون سی جان ہے جو اُس کے اوصاف کا گیت نہیں گاتی۔

وہ خبیر ہے، اور ہر شخص کے حال کی خبر رکھتا ہے۔ وہ بصیر ہے، اور سب پر نگاہ رکھتا ہے۔ اُس کے گلہائے ناز سے دامن بھرنے کے لیے نیاز کی ضرورت ہے، اور اُس کی قدرت کا تماشا کرنے کے لیے آنکھ ہونی چاہیے! وہ یکتا ہے اور صفتِ یکتائی سے موصوف، واحد ہے، اور اپنی وحدانیت سے مشہور۔ ایسا رفیع ہے کہ اُس کی بارگاہ تک فرشتے بھی نہیں جا سکتے! مگر ایسا سمیع ہے کہ ہر عاجز کی التجا سُنتا ہے۔ زبانِ قلم میں یہ طاقت کہاں کہ اُس کے اوصاف کو ایک ایک کر کے لکھے۔ ہاں اگر وہ (خدا) خود اپنی تعریف کرے تو شاید اپنے کمالات کے بیان سے عہدہ برآ ہو جائے!

نعت

بے حد وحساب درود اُس فصیح پر، جس نے فصاحت کا میدان جیت لیا، اور بے شمار سلام اُس بلیغ پر جو خدا تک پہنچا مگر مغرور نہ ہوا۔ وہ بادشاہ جو سراپا جلال و جبروت ہے۔ وہ روشن چاند جو کفر و گمراہی کی تاریکی کا مٹانے والا ہے، وہ پیشوا جس کی قیادت کے بغیر کوئی مشکل آسان نہیں ہو سکتی، ایسا رہنما جس کی رہبری نہ ہو تو کوئی راستہ نہیں سُوجھ سکتا۔ وہ امیر جس کے فرمان کو ہم دل و جان سے قبول کرتے ہیں، ایسا دستگیر کہ توفیق ہو تو اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ ایسا صبیح کہ اُس کی صباحت نے آئینہ عالم کو روشن کر دیا ہے، اور ایسا ملیح کہ اُس کی ملاحت انسانوں کے رخساروں کا نمک بن گئی ہے۔ وہ ایسا نگار ہے کہ اُس کے پانو تلے کی خاک جانوں سے زیادہ قیمتی ہے، وہ ایسی بہار ہے کہ اُس کے سبز جھنڈے کے سائے میں اک زمانہ چل رہا ہے۔ ایسا مددگار کہ حشر والوں کی نگاہیں اُس کی شفاعت پر لگی ہوئی ہیں، نہیں نہیں بلکہ سارے عالم کا کاروبار اُس

کی عنایت سے چل رہا ہے۔ خدا کی رحمت اور درود و سلام ہوں اُس پر، اُس کی پاک اور طیب و طاہر اولاد پر، کہ ان میں سے ہر ایک مومنوں کا امام اور گناہگاروں کا شفاعت کرنے والا ہے!

عرضِ مصنّف

تمام موجودات کے معبود، اور خالقِ ودود کی تعریف، نیز اُس صاحبِ مقامِ محمودؐ[1] پر بے شمار درود اور بے حساب سلام بھیجنے کے بعد، فقیر میر محمد تقی المتخلص بمیرؔ کہتا ہے، کہ میں اِن دنوں بے کار تھا اور کسی مونس کے بغیر گوشۂ تنہائی میں پڑا ہوا تھا؛ تو یہ اپنے حالات جس میں زمانے کے حالات اور سوانح، نیز حکایتیں اور روایتیں بھی آگئی ہیں، میں نے لکھ ڈالے، اور یہ کتاب، جس کا نام ذکرِ میرؔ ہے، کچھ لطیفوں پر ختم کی۔ دوستوں سے اُمید ہے کہ اگر کوئی غلطی پائیں تو اُس سے چشم پوشی کریں اور اصلاح کر دیں۔

★

---

[1] حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

میرے بزرگ

میرے آباد اجداد، ملکِ حجاز کو خیر باد کہہ کر، طرح طرح کی مشکلیں اور مصیبتیں جھیلتے ہوئے ہندستان میں پہلے پہل دکنی ساحلوں کی طرف آئے تھے۔ اور وہاں سے یہ پورا قبیلہ احمد آباد (گجرات) میں آکر بس گیا، پھر اُن میں سے کچھ تو مستقل طور پر وہیں رہ پڑے اور کچھ نے آگے بڑھ کر تلاشِ روزگار کا فیصلہ کیا۔ چناں چہ میرے جدِ اعلا دارالخلافہ اکبر آباد (آگرہ) آگئے۔ لیکن آب و ہوا کی یہ اچانک تبدیلی اُنھیں راس نہ آئی اور بیمار پڑ گئے۔ اسی بیماری میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُنھوں نے اپنی یادگار صرف ایک لڑکا چھوڑا، جو میرے دادا تھے۔

میرے دادا بہت دنوں تک روزگار کی جستجو میں سرگرداں رہے، بالآخر اُنھیں اکبر آباد کے نواح میں فوج داری کا عہدہ مل گیا۔ وہ سادہ زندگی گزارتے تھے، اُن کی عمر پچاس سال ہوگی، کہ بیمار پڑ گئے۔ کچھ دنوں دوا دارو کی، مگر پوری طرح صحت یاب نہ ہوئے تھے کہ گوالیار کا سفر پیش آیا۔ زیادہ چلنے پھرنے اور بھاگ دوڑ کرنے سے مرض کا دوبارہ حملہ ہوا اور وہ گوالیار ہی میں انتقال فرما گئے۔ اُن کے دو لڑکے تھے ــــــ بڑے کے دماغ میں خلل تھا، یہ جوانی ہی میں مر گئے۔ اُنھوں نے اپنی کوئی اولاد نہیں چھوڑی، چھوٹے، میرے والد تھے۔ اُنھوں نے فقر و درویشی اختیار کی اور مروجہ علومِ ظاہری کی تحصیل کے لیے، جن کے بغیر عالمِ معنی تک پہنچنا دشوار ہے، حضرت شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی[1] کی خدمت میں پہنچے۔

---

[1] شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی کے وقائع، حالات، اور ملفوظات نہیں ملتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اتنے بڑے آدمی نہ تھے کہ

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

جو ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔

حضرت کی خدمت میں رہ کر میرے والد نے ترک و تجرید اختیار کی اور کڑی ریاضت کرکے اپنے پیر و مرشد کی رہ نمائی سے درویشی کی اعلا منزلوں پر پہنچ گئے:

پس از خرابیِ بسیار دل بدست اُفتاد!

والد کی سیرت

وہ صالح اور نیک سیرت جوان تھے، دل میں عشق کی گرمی رکھتے تھے اور علی متقی کے خطاب[1] سے مشہور ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن اُنھوں نے اپنے پیر و مرشد سے عرض کیا کہ میں نے آپ کی خدمت میں رہ کر اپنے عقائد جیسا کچھ درست کرلیے ہیں وہ آپ پر واضح ہی ہے۔ لیکن حاکمِ شام[2] کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: "کسی دن بتائیں گے!"

مدت بعد، ایک صبح، منھ اندھیرے، محرم خاں خواجہ سرائے شاہ جہانی کی مسجد میں تشریف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اُن پر کوئی مستقل کتاب لکھی جاتی۔ البتہ تاریخ محمدی مصنفہ مرزا حارثی بدخشی میں ۱۱۰۹ھ کے مرنے والوں میں اُن کا ذکر اس طرح ملتا ہے:

"شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی، جامع المعقول و المنقول در اکبر آباد فوت شد" (صفحہ ۱۰۱۳)

مصنف تاریخ محمدی نے 'کوئی کتاب ہے افق المبین' اس کے حوالے سے اُن کی تاریخ وفات لکھی ہے اسی کتاب میں متعدد اہلِ ظاہر و باطن بزرگوں کی تاریخ وفات لکھتے ہوئے افق المبین کا نام لکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مصنف کون ہے؟" (اقتباس از مکتوب مولانا امتیاز علی خاں عرشی بموسومہ مترجم)

[1] میر کی ایک تحریر سے، جو اسی کتاب میں آگے آئے گی، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اُن کے والد کا نام میر محمد علی تھا، اور اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے وہ "علی متقی" مشہور ہو گئے تھے۔

[2] مولوی عبدالحق، مرتب ذکرِ میر نے، اس موقع پر سرخی قائم کی ہے "باپ کی اپنے پیر سے گفتگو در بارۂ یزید" لیکن میرا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

لائے۔ میرے والد کے ملازم اُن کے وضو کے لیے پانی لانے کو دوڑے، مگر والد خود اُٹھے، لوٹا لیا اور شاہ صاحب کو وضو کرانے لگے۔ اُس وقت شاہ صاحب نے فرمایا۔ "میاں علی متقی! تمام عمر اُس کا نام میری زبان پر نہیں آیا۔ اِس کے لیے میں خدا کا شکر کس طرح ادا کروں!" والد کہتے تھے، خدا کا شکر ہے کہ اُس کے بعد میں نے بھی کبھی اس کا نام نہیں لیا۔

علی متقی روز و شب خدا کی یاد میں محو رہتے تھے۔ کبھی استغراق کی کیفیت کم ہوتی تو فرماتے: "بیٹا، عشق کرو، عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ہے اگر عشق نہ ہوتا تو نظامِ عالم قائم ہی نہ ہو سکتا۔ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے، عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے، عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔ آگ میں سوزش عشق سے ہے اور پانی میں روانی عشق سے ہے۔ خاک میں عشق کا قرار ہے اور ہوا میں اُس کا اضطراب ہے۔ موت عشق کی مستی اور زندگی اُس کی ہوشیاری ہے، دِن عشق کی بیداری اور رات اُس کی نیند ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) خیال ہے کہ یہاں "حاکمِ شام" سے حضرت امیر معاویہؓ مراد ہیں وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت (۱۳ھ/۶۳۴ء تا ۲۴ھ/۶۴۴ء) میں چار سال اور حضرت عثمانؓ کے عہد (۲۴ھ/۶۴۴ء تا ۳۵ھ/۶۵۵ء) تک شام کے حاکم رہے تھے۔ ۴۱ھ/۶۶۱ء میں خود خلیفہ ہوئے اور ۶۰ھ/۶۸۰ء میں انتقال فرمایا۔

یہاں "عقائد کے درست کرنے" کی بات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ پہلے میر کے والد سنّی مذہب تھے، اور شیخ کلیم اللہ کی صحبت میں رہ کر تشیّع یا تفضیلیت کی طرف مائل ہوئے! امیر معاویہؓ کے سیاسی کردار کے متعلق بہت سے اہلِ سُنّت و جماعت حضرات کو بھی شبہ رہتا ہے، یزید ابنِ معاویہ کی سیاسی غلطیوں پر ہمیشہ اجماعِ اُمّت رہا ہے، اس لئے علی متقی کا یزید ابن معاویہ کے بارے میں استفسار کرنا اتنا قرینِ قیاس نہیں جتنا یہ کہ اُنھوں نے حضرت معاویہؓ کے متعلق اپنا عقیدہ درست کرنے کے لیے سوال کیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (ن۔ا۔ف)

مسلمان عشق کا جمال اور کافر اُس کا جلال ہی۔ نیکی عشق کا قرب اور گناہ اس سے دوری ہی، جنت عشق کا شوق اور دوزخ اُس کا ذوق ہی۔ عشق کا مقام و مرتبہ، بندگی سے، زہد و عرفان سے، سچائی اور خلوص سے، اشتیاق اور وجدان سے بھی بہت بلند و بالا تر ہی۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آسمانوں کی یہ گردش بھی عشق ہی کے باعث ہی، یعنی وہ اپنے محبوب تک پہنچنے کی دُھن میں برابر سرگرداں ہیں ؎

بے عشق نباید بود، بے عشق نباید زیست
پیغمبرِ کنعانی، عشق پسرے دارد[1]

وہ دن بھر الحاح و زاری کرتے، راتوں کو جاگتے، اُن کی جبینِ نیاز ہر وقت بارگاہِ الٰہی میں جھکی رہتی، ہمیشہ شرابِ شوق سے سرشار رہتے، اُن کا دامن (تمام آلائشوں سے) پاک تھا، اُن کا نورانی چہرہ عابدوں کی محفل کا رونق افزا تھا، وہ آفتاب تھے، لیکن (خلوت پسند) اتنے کہ اپنے سائے سے بھی گھبراتے تھے: جب کبھی اپنے آپ میں آتے، فرماتے: "بیٹا۔ دنیا ایک ہنگامے سے زیادہ نہیں، اپنے دامن کو دنیا داری اور معصیت کی آلائش سے پاک صاف رکھو۔ اللہ کی محبت کو اپنا مشغلہ بناؤ، اور عاقبت کی فکر سے غافل نہ رہو۔ جو صاحبِ نظر ہیں وہ دنیا کو ایک دھوکا سمجھتے ہیں۔ زندگی ایک وہم ہی اور وہم کی بنیادوں پر اُمیدوں کے محل بنانا پانی کو رسّی سے باندھنے کی سعیِ لاحاصل کے مترادف ہی۔ طولِ امل سے بھولے رہنا چاندنی کو گزوں سے ناپنا ہی۔ اسے نہ بھولو کہ تمھیں دنیا سے سفر کرنا ہی، زادِ راہ کی فکر کرو تاکہ نقصان نہ اُٹھاؤ۔ اُس ذات کی طرف متوجہ رہو، کائنات کو جس کا

---

[1] (مطلب، عشق کے بغیر (قائم) نہیں رہا جا سکتا، نہ بغیر عشق زندہ رہ سکتے ہیں۔ (دیکھو) پیغمبرِ کنعانی (حضرت یعقوب علیہ السلام) بھی اپنے بیٹے سے عشق کرتے تھے۔ ۱۲

آئینہ کہتے ہیں، اور اپنی ذات کو اُسے سونپ دو، جسے دل میں تلاش کرتے ہیں، مقصود کا ملنا یقینی ہے، بشرطیکہ ذوقِ طلب سچا ہو۔ اگرچہ ہر چیز میں اُسی کا جلوہ ہے تاہم، ہمیں اِس کے اظہار میں شرطِ ادب ضروری ہے۔

(نکتہ) خدا کا تعلق بندوں کے ساتھ وہی ہے، جیسا روح کا جسم کے ساتھ، کہ تمہارا وجود بغیر اُس کے نہیں، اور اُس کی نمود بغیر تمہارے نہیں۔ یہ کائنات ظہور میں آنے سے پہلے عینِ ذات تھی، اور نمودِ صوری کے بعد وہی ذات عینِ کائنات ہے! ؎

مشکل حکایتے ست کہ، ہر ذرّہ عینِ اوست

اما نمی تواں کہ اشارت، بَدُو کنند[1]

وہ درویش، اور درویش پرست تھے، شکستہ دل اور شکستگی کے مشتاق، متواضع، بھری مجلس میں تنہا، وسیع مشرب، فقیر کامل، اور منکسر مزاج ——— کبھی پیار سے مجھے گود میں لے لیتے تو میرا رنگ دیکھ کر فرماتے: "اے سرمایۂ جان! یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں سُلگ رہی ہے، یہ کیسی جلن ہے جو تیری جان کے ساتھ ہے۔ اِس پر میں ہنستا اور وہ روتے جاتے۔ افسوس کہ میں نے زندگی میں اُن کا مقام نہ پہچانا۔ وہ ایسے انسان تھے کہ اپنے حال میں گم تھے، کبھی کسی کے لیے بارِ خاطر نہ بنے۔

ایک دن اِشراق کی نماز کے بعد میری طرف توجہ فرمائی، میں اُس وقت کھیل کود میں محو تھا، دیکھ کر فرمایا: "بیٹا! زمانہ سخت تیز رفتار ہے کسی کو مہلت نہیں دیتا، اپنی تربیت سے غافل نہ

---

[1] مشکل بات تو یہ ہے کہ ہر ذرّہ عین ذاتِ خداوندی ہے، پھر بھی یہ ممکن نہیں کہ اُس (ذاتِ خداوندی) کی نشان دہی کر سکیں، (یعنی کسی چیز کو لے کر کہہ سکیں کہ یہ خدا ہے، حالانکہ ہر شے کا ظہور خدا کی ذات سے قائم ہے)۔ ۱۲

رہو۔ اس راستے میں بڑے نشیب و فراز ہیں، دیکھ بھال کر، پھونک پھونک کر قدم رکھو۔

نشانِ پائے تو فردِ حسابِ زندگی است
قدم شمردہ، دریں کہنہ خاک داں بردار[1]

یہ بھی کوئی کھیل ہے جو کھیلتے ہو، کیسا نازیبا کام کرتے ہو، اس سے لو لگاؤ جس کے خرامِ ناز پر کائنات نچھاور ہو، جس کی ایک ایک ادا پر ہزار دل اور جانیں قربان ہوں۔ اس شاہدِ گل پر بلبل بن کر فدا ہو جو سدا بہار ہے۔ آسمان کسی کے لیے اپنی چال نہیں بدلتا، جو کرنا ہے جلد کر لو، زندگی کی مہلت غنیمت سمجھو اور اپنی حقیقت کی تلاش کرو۔"

ان کی متبرک صورت باطن کا آئینہ تھی، وہ اس عالمِ اجسام میں ایسے بزرگ تھے جنھوں نے عنانِ اختیار کبھی ہاتھوں سے نہیں جانے دی۔ اتنے پرہیزگار کہ کسی نامحرم نے کبھی ان کے ہاتھ اور پاؤں تک نہیں دیکھے۔ اگر آپ انھیں دیکھتے تو کہتے کہ کوئی فرشتہ آدمی کے روپ میں آ گیا ہے، اور ایسی خوبی سے اگلوں نے بھی استقامت کا ثبوت کم ہی دیا ہے۔ اخلاقِ حمیدہ، اوصافِ ستودہ، طبعِ مشکل پسند اور دلِ دردمند رکھتے تھے۔ آنکھیں نم، اور ہر وقت ایک کیفیت سی طاری رہتی۔

لاہور کا سفر

کہتے ہیں کہ ایک دن پریشاں حال گھر میں داخل ہوئے۔ بوڑھی ماما بیٹھی ہوئی تھی اس سے کہا کہ آج مجھے بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے، صبر نہیں ہو سکتا۔ اگر تھوڑی سی روٹی مل جائے تو جان میں جان آئے۔ ماما نے کہا گھر میں تو کچھ ہے نہیں۔ انھوں نے پھر کہا، بھوک بے حد ہے۔ ناچار ماما اٹھی بنیے کی دکان سے آٹا اور گھی لائی کہ روٹی پکائے۔ اس اثنا میں انھوں نے پھر شدتِ گرسنگی کا اظہار کیا۔ ماما جھنجلا اٹھی اور ترش رو ہو کر بولی: "

---

[1] تمہارے نقشِ پا بھی زندگی کے حساب کی کھتونی ہیں۔ اس دنیا میں قدم بھی گن گن کر رکھنے چاہییں، (یعنی زندگی کو بے مصرف و بے مقصد نہیں گزارنا چاہیے)۔

صاحب یہ فقیری ہے۔ اس میں یہ ناز نخرے نہیں چلتے۔ والد صاحب نے کہا، اچھا تو دل جمعی سے روٹی پکا، میں ایک فقیر سے ملنے لاہور جا رہا ہوں، اس سے مل کے واپس آجاؤں گا۔ یہ کہا اور اپنا رومال اٹھایا جو گریہ شبی سے تربتر ہو رہا تھا اور چل پڑے۔ ماما پریشاں حال اُن کے پیچھے دوڑی اور دامن پکڑ لیا۔ ہر چند خوشامد کی مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا، آخر ہار کر بیٹھ رہی اور آئینے پر پانی ڈال کر شگون دیکھنے لگی۔ والد صاحب جہاں منزل کرتے، اللہ کریم اپنی شانِ رزاقی سے کھانے پینے کا سامان مہیا کر دیتا۔ کچھ ہی دنوں میں لاہور پہنچ گئے اور اُس مکار درویش سے ملے جو دریائے راوی کے کنارے ایک بارہ دری میں رہتا اور دنیا بھر کو گم راہ کر رہا تھا۔ لوگوں میں وہ "خفشاں نمود[1]" کے نام سے مشہور تھا۔ اُس نے فارسی کے کچھ فقرے یاد کر رکھے تھے۔ نا سمجھ لوگ جو اُس کی ریاکاری کو پرکھ نہیں سکتے تھے اُس کے سامنے ناک سے لکیریں کھینچتے تھے۔

---

[1] خفشاں نمود کا تعلق میر محمد حسین مشہدی کے گروہ سے معلوم ہوتا ہے جس نے عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء) کے بعد ایک نئے مسلک کی بنیاد ڈالی تھی، وہ اپنے تئیں "بیگوک" کہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر نبی کے ۹ بیگوک ہوتے ہیں اور میں دینِ محمدی کا سب سے آخری بیگوک ہوں۔ میر محمد حسین عمدۃ الملک امیر خاں صوبیدار کابل کی لے پالک کا شوہر، اور امیر خاں کا داروغہ خوشبو خانہ تھا۔ وہ علوم متداولہ میں کافی دستگاہ رکھتا تھا اور نہایت شیریں بیاں و نغز گفتار تھا۔ اس نے عمدۃ الملک امیر خاں اور عالمگیر کی وفات کے بعد بہادر شاہِ اوّل کے عہد میں نیا ڈھونگ رچایا، اپنا نام 'نمود المنود' یا 'نمود اللہ' رکھا اور اپنا مرتبہ نبوت و ولایت کے درمیان ظاہر کیا۔ ایک کتاب "اقوزہ مقدسہ" کے نام سے تصنیف کی اور اُسے الہامی ظاہر کیا۔ اس نے ایسے الفاظ اور فقرے وضع کر رکھے تھے جو قطعاً مہمل تھے اور جن کا مطلب خود اُسے بھی معلوم نہ تھا۔ اُس کے مرید "فربود" کہلاتے تھے اور سلام کی جگہ "نمود بودال" کہتے تھے۔ ۶ ذی الحجہ ان کا مذہبی جشن کا دن تھا اور نماز بھی سب سے علیحدہ تھی جسے وہ 'دوید' کہتے تھے۔ 'نما نمود'، 'نفار' اور 'دیدٗ' اس کے بیٹے تھے اور دو بیٹیاں 'نمانہ خورد' و 'نمانہ کلاں' تھیں۔ فرخ سیر کے زمانے میں اس کے فریب کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ چناں چہ ایک دن فرخ سیر خود (بقیہ اگلے صفحہ پر)

وہ کہنے لگا کہ میں تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دینِ مبارک کی تائید و ترویج کر رہا ہوں، اور جاہل مجھے گمراہ اور دھوکے باز سمجھتے ہیں۔ میرے والد کو یہ سُن کر غصہ آگیا اور فرمایا کہ "او کمینے، ہمارے پیغمبر کا دین تجھ ایسوں کی تائید کا محتاج نہیں۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کر، میرے اور تیرے درمیان یہ تلوار رکھی ہے، ایسا نہ ہو کہ مارا جائے۔"

غرض کہ یہ پہلی ہی ملاقات بے مزہ ہو گئی، میرے والد بڑے ترش رو ہو کر اُٹھے اور جا کے ایک فقیر کے تکیے میں رات بسر کی، جب صبح ہوئی وہ ریاکار معذرت خواہی کے لیے آیا۔ میرے والد نے فرمایا کہ تیرا معافی مانگنا بے فایدہ ہے۔ کل کیا کھری کھری سنائی تھیں جو آج سناؤں گا۔ جب تیری روسیاہی کا پردہ چاک ہو گیا تو اب معذرت کیسی؟ جا کہیں اور اپنا منھ کالا کر، ایسا نہ ہو کہ ہر جگہ بدنام و رسوا ہو جائے۔ اِس پردہ

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ) نیاز مندانہ اُس کے حجرے میں آیا اور قدم بوس ہوا، بادشاہ کی عقیدت دیکھ کر عوام جہلا میں میر محمد حسین کا مرتبہ اور بھی بڑھ گیا۔ محمد شاہ کے زمانے میں قمر الدین خاں وزیر کے والد نواب محمد امین خاں نے اُسے گرفتار کرنا چاہا مگر وہ خود اس کے دامِ فریب میں آگیا، اتفاق سے محمد امین خاں بیمار پڑ گیا اور اُسے یہ گمان ہوا کہ محمد حسین کی بددعا سے میری شامت آئی ہے، وہ اُلٹا معافی کا خواستگار رہا، اور پانچ ہزار روپے نذر بھیجے، مگر محمد حسین اکڑ گیا اور اس سے عوام میں اس کی ساکھ بڑھ گئی۔ اس کی موت کے بعد بڑا بیٹا نما نمود سجادہ نشین ہوا لیکن اس نے باپ کے خلیفۂ اوّل، شریکِ کار اور رازدار "دوجی بار" کو خوش نہ رکھا اس نے پردۂ فریب چاک کر دیا۔ اس طرح احمد شاہ کے زمانۂ حکومت میں یہ پُر فریب تحریک ختم ہو گئی۔

میر محمد حسین کے پیرو کار، خلیفہ اور مرید ساری سلطنت میں پھیل گئے تھے اور انھیں "نشان" یا خطاب عطا کیے گئے تھے۔ 'خفتاں نمود' بھی اسی سلسلے کا مکار پیرو کار تھا۔ ۱۲

شرم سے پانی پانی ہو گیا مگر بڑی حد تک اس کی اصلاح بھی ہو گئی، یوں یہ صحبتِ بے مزہ ختم ہوئی۔

لاہور سے واپسی یکایک والد صاحب کو واپسی کا خیال پیدا ہوا۔ اگرچہ کچھ زادِ راہ پاس نہیں تھا، تاہم محض اللہ کے بھروسے پر چل پڑے اور دس بارہ دن کی مسافت طے کر کے دہلی پہنچ گئے۔ یہاں شیخ عبدالعزیز عزت کے بیٹے قمرالدین خاں کے مکان پر قیام کیا جو صوبے کے دیوان تھے۔ اور جن سے کچھ قرابت کا تعلق بھی تھا۔ شہر کے لوگ جوق در جوق اُن سے نیاز حاصل کرنے کے لیے آئے اور بڑی تعظیم و تکریم کی۔ بہتوں نے اس درویشِ خدامست کے ہاتھ پر بیعتِ ارادت بھی کی۔ ان کی نگاہ کے اثر سے بہت لوگ فیض یاب ہوئے۔ اُن کے وضو کا پانی بطور تبرک لے جاتے اور مریضوں کو پلاتے، اللہ کے فضل سے بیمار صحت یاب بھی ہو جاتے۔

وہ اتنا روتے تھے کہ ہچکی بندھ جاتی، جو آہ اُن کے دل سے نکلتی، آسمانوں کا جگر چیر جاتی۔ شہر بھر میں غلغلہ مچ گیا کہ ایک درویشِ کامل یہاں آیا ہوا ہے۔ اُمرا نے بھی ملاقات کی آرزو ظاہر کی، مگر اُنھوں نے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ "میں فقیر ہوں، آپ امیر، میرا آپ کا کیا تعلق؟" امیر الامرا صمصام الدولہ[1] نے سابقہ تعلقات کا واسطہ دے کر التجا کی کہ مجھے دولتِ دیدار سے محروم نہ فرمایئے اجازت دیجیے کہ یہ روسیاہ حاضر ہو کر قدم بوس ہو۔ والد صاحب نے تبسم کیا اور کہا "ملاقات کے واسطے

---

[1] یہ وہی امیر الامرا ہیں بعد میں جن کی سرکار سے میر کو ایک روپیہ یومیہ وظیفہ ملتا تھا، اُن کا تعارفِ آئندہ اوراق میں اُسی موقع پر پیش کیا جائے گا۔ (مترجم)

مناسبت ضروری ہے۔ اُمید ہے کہ آپ مجھے معذور سمجھ کر میرے حال پر چھوڑ دیں گے۔" جب کثرتِ خلائق سے تنگ آ گئے، تو ایک رات کو وسطِ شب میں اُٹھے اور تہجد کی نماز پڑھ کر شہر سے نکل گئے۔ لوگوں نے بہتیری تلاش کی مگر اُن کی گردِ پا بھی نہ پا سکے۔" (ملصنقبہ)

به پاکاں کار کی گیرد فلک تنگ
کہ عیسیٰ از سرِ سوزن بروں شد[1]

دو تین دن میں اکبر آباد (آگرہ) سے تین منزل اُس طرف، بیانہ میں وارد ہوئے جو سادات اور شرفا کی قدیم بستی ہے، اور یہاں ایک مسجد میں قیام فرمایا۔

ایک سیدزادے سے ملاقات

(حکایت) بیانہ میں ایک نوجوان سیدزادہ نہایت حسین اور خوش رو نظر سے گزرا۔ آپ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور جذبِ کامل سے کھینچ بلایا۔ اُس پری وش کی حالت ایسی بدلی کہ دیوانہ وار بے ہوش ہو کر آپ کے قدموں میں گر پڑا۔ اُس کے عزیز سمجھ گئے، کہ لڑکے کی حالت درویش کی نظر کے اثر سے دگرگوں ہو گئی ہے۔ اُن سے التجا کی کہ اِس نوجوان کی حالت پر رحم فرمایئے۔ آپ نے تھوڑا سا پانی منگایا اور کچھ دعا پڑھ کر اُس پر دم کیا۔ جیسے ہی پانی حلق سے نیچے اُترا وہ لڑکا ہوش میں آ گیا اور نہایت ادب سے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور عرض کی: "اگر آپ کچھ دن میرے مہمان رہیں تو عین بندہ نوازی ہوگی، ورنہ۔ تو میں جانتا ہوں کہ جس عالم میں آپ ہیں وہاں ناز کا گزر بھی نہیں، بے نیازی

---

[1] (مطلب) پاک دل لوگوں پر آسمان کب سختی کرتا ہے، (دیکھو) کہ حضرت عیسیٰ کیسی شکل میں پھنسے تھے مگر کتنی آسانی سے نکل گئے!

ہی بے نیازی ہے' والد صاحب نے فرمایا: کہ دوستی کی راہ سے دعوت قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا' لیکن میں پا بہ رکاب ہوں' کل یہاں سے روانگی کا عزم ہے۔" حاضرین نے کہا: "ہم آپ کی مرضی کے تابع ہیں۔ اصرار کرنا بے ادبی ہوگی' لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر آپ اس لڑکے کے گھر تشریف لے چلیں اور کچھ تناول فرمائیں تو آپ کی عنایت سے کچھ بعید نہ ہوگا۔"

چوں کہ شہر کے عمائد و اکابر کی درخواست کا پاس تھا' فرمایا' اچھا منظور ہے لیکن فقیر کا دل کبھی شاد رہتا ہے کبھی ملول' کوئی ہمارے حال سے تعرض نہ کرے۔" لوگوں نے کہا: "ہماری کیا مجال ہے اور کیسے یہ گوارا ہوگا کہ حضور کے خلافِ مزاج کوئی بات ظہور میں آئے اور یہ سعادت شقاوت میں بدل جائے!" غرض (والد صاحب) اُن لوگوں کے ساتھ لڑکے کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں کچھ کھانا بھی تناول فرمایا۔

شادی کی مذمت

اتفاق سے اُسی رات' اُس لڑکے کی شادی تھی' تھوڑی رات گئے وہ لڑکا کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ "حضور بھی قدم رنجہ فرما کر محفلِ شادی کی رونق افزائی کریں تو ہمارے لیے فخر کا مقام ہوگا۔" فرمایا: "مبارک ہو ــــ مگر افسوس کہ شادی خدا پرستی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔"

(فائدہ) اے عزیز تو نہیں جانتا کہ لفظِ "داماد" 'دام' اور 'آد' سے مرکب ہے۔ اور 'آد' فارسی میں نسبت کے لیے آتا ہے' جیسے آباد[1] اور نوشاد میں ـــ یعنی جس کی شادی ہوئی وہ اسیرِ دام بلا ہوا۔ میں تو آزاد طبع آدمی تھا اس جال سے برقِ تیز رفتار کی طرح نکل گیا[2]۔ خیر مجھے اِن باتوں سے کیا سروکار؛

---

[1] آباد اور نوشاد میں 'آد' کلمہ نسبت ہے چونکہ ؎ ہر کجا چشمۂ بود شیریں مردم و مرغ و مور گرد آیند
اِسی لیے آباد' رونق کی جگہ کو کہتے ہیں اور آب کے معنی رونق کے بھی ہوئے۔ "نوش" کے معنی فریفتہ کرنے کے ہیں۔ 'نوشاد' ایک شہر کا نام ہے جو حسینوں اور خوب رویوں کی سرزمین مشہور ہے۔ (ن۔ا۔ف)

[2] اس جملے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ محمد علی کی بیوی' یعنی میر کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (باقی)

جاؤ، آدمی اس معاملے میں مجبور ہے میں بھی ابتدائے جوانی میں شرابِ عیش سے سرشار تھا۔ آخرکار سوائے خمار کے جو تکلیف دہ ہے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ جب خدائے بزرگ نے مجھے اس گرفتاری سے نجات دی تو پھر میں نے اپنے تئیں مضبوط و مستحکم بنایا اور شمع وار ایک پانو پر جلنے لگا"۔۔۔ اب تو ایک راکھ کے ڈھیر سے زیادہ نہیں ہوں، دل ہی نہیں رہا کہ ہوس پیدا ہو، نہ وہ دماغ ہے کہ لہو و لعب کی طرف مائل ہو۔ جشنِ شادی کی اِن مشغلوں سے جو تمھارے ساتھ ہیں، خیال ہوتا ہے کہ تم کیسے غزالِ رعنا ہو، حیرت ہے کہ رم نہیں کرتے اور اس جال سے نکل نہیں بھاگتے۔ اگر عقلِ سلیم ہے تو اس نکتے کو سمجھ لو کہ "اللہ بس باقی ہوس"!

مختصر یہ کہ وہ لڑکا دُلہن کے گھر گیا، اور یہ درویشِ بے نیاز اس شہر سے چلے آئے ڈیڑھ دن کا راستہ طے کرکے اکبرآباد پہنچے اور اطمینان سے اپنے گھر میں قیام کیا۔

نوجوان کی سرگردانی (حکایتِ شوق) جب اُس حسین نوجوان کو معلوم ہوا کہ درویش شہر چھوڑ کر جا چکے ہیں، تو بیوی کو مکان پر چھوڑا، خود پانی تک نہیں پیا، اُسی وقت گرتا پڑتا آنسو بہاتا اُن کی تلاش میں جنگل کی طرف چل دیا، جو کوئی راستے میں ملتا، اُس سے درویش کا پتا نشان پوچھتا، کبھی اِدھر دوڑتا کبھی اُدھر۔ مگر کوئی راہبر اُن کا پتا بتانے والا نہ ملا۔ مایوس ہو کر اُس نے ایک آہِ جگر خراش بلند کی اور کہا "اے میرے خضر! میں نادان، پریشان و سرگرداں ہوں، آیئے اور میری راہ نمائی فرمایئے۔ اگر اِس مصیبت میں میری دست گیری فرمائیں تو سمجھوں مجھے بڑا خزانہ مل گیا۔ وہ دامن جسے میں پھولوں سے بھرا کرتا تھا، آج چاک چاک ہے۔ جو سر کبھی تکیۂ ناز پر رکھا رہتا تھا اب اُس پر خاک پڑی ہے، میرے اوپر رحم کیجیے کہ اب تو پانو بھی چلنے سے رہ گئے ہیں،

(بقیہ) یہاں علائق میں پھنس کر بھی 'ترک' حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہو۔ (ن-ا-ف)

کرم کیجیے کہ سوائے آوارگی کے اب اس ویرانے میں میرا کوئی ساتھی نہیں رہا۔ آپ خورشید ہیں اپنے اِس حقیر ذرّے پر بھی روشنی ڈالیے۔ آخر یہ کیا ہو گیا کہ آسودگی نے مجھ سے مُنھ موڑ لیا اور کیا ہوا کہ آوارگی اور سراسیمگی مجھ پر سوار ہے۔ (المصنفہٖ) ؎

سخت در کارِ خویش حیرانم
چہ بدل خورد من نمی دانم [1]

کبھی کہتا کہ: "بگولے کی طرح وحشت آمادہ ہوں، شاید آپ نے مجھے فراموش کر دیا ہے۔ ہر چند مجھے اپنی نارسائی کا یقین ہے، لیکن محض آپ کے کرم کی آس لگائے دشت و کہسار میں آوارہ پھر رہا ہوں، وہ رُخسار جو گُلِ تر سے مشابہ تھے دھوپ کی تمازت سے تونس گئے ہیں وہ آنکھیں جن سے ہرن بھی شرماتے تھے اب سفید ہو گئی ہیں۔ آپ آفتاب ہیں اور میں سایۂ افتادہ۔ آپ سوار ہیں اور میں پیادہ، کسی طرف سے بھی غبار اُٹھتا ہے تو مجھے آپ کی آمد کا گمان ہوتا ہے، لیکن جب آپ نظر نہیں آتے تو رو رو کر اپنا گلا پھاڑتا ہوں، آپ تو تمام اجزا پر محیط یعنی کامل ہیں پھر ہم غافلوں کے حال سے کیوں غافل ہیں؟" نوجوان اِسی طرح روتا دھوتا چلا جا رہا تھا، کبھی کھڑا ہو جاتا، کبھی چلنے لگتا کہ اچانک ایک بزرگ نمودار ہوئے اور اُنھوں نے بڑے لُطف اور نرمی سے فرمایا "اے نوجوان! کسے ڈھونڈھتا ہے اور یہ کیا ہے جو تو کہہ رہا ہے، جا بے چینی اور اضطراب چھوڑ دے، علی متقی اکبر آباد میں ملیں گے" یہ مژدہ سُن کر اُس کے دلِ بے قرار کو قرار آیا، وہ دل جمعی سے چلنے لگا اور خدا کا شکر ادا کیا، آدھی رات کے قریب شہر (اکبر آباد) میں داخل ہوا،

---

[1] (مطلب) میں اپنے معاملے میں سخت حیران ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے دل کو کیا ہو گیا؟ (ن-ا-ف)

راستہ تلاش کرتا، نام و نشان پوچھتا آیا اور والد صاحب کے قدموں پر گر پڑا۔ مارے خوشی کے رُخساروں پر آنسو ڈھلک آئے۔ ناکامی کا سارا رنج و کلفت حصولِ مراد سے، جو اُس کے واہمہ و خیال میں بھی نہیں تھی، دُور ہوئی۔ والد صاحب نے اُس کے حسن و جمال کی طرف ایک نظر کی اور اُسی پاک نظر نے اُسے صاحبِ کمال بنا دیا، اتنی محبت سے پیش آئے کہ تحریر میں نہیں سما سکتی اور اُس سے ایسی دلداری کی باتیں کیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اُس کا سر چھاتی سے لگایا اور بے حد محبت سے فرمایا "اے میرا مان اللہ تم نے بڑے مصائب جھیلے، زمانے کے سرد و گرم دیکھے، مگر اب جدائی کا رنج نہیں اُٹھانا پڑے گا، اب میرا گھر تمھارا گھر ہے۔ میں اور میرے لڑکے بالے، ہم سب تمھارے ہیں۔ خوش ہو کہ تم نے اپنی نہرِ حیات کا رشتہ ایک عجیب دریا سے جوڑ لیا ہے، مسرور ہو کہ سروِ سہی کی مانند تم نے اپنا دامن سب سے جھاڑ لیا، چاہیئے کہ اب دل جمع ہو جاؤ اور دروازہ بند کر کے سب سے قطع تعلق کر لو، تھوڑے دن اپنے آپ میں گم رہو تاکہ خدا کو اپنی طرف کھینچ سکو۔

سیّدزادے کو تلقین

(فائدہ) سُن لو کہ وقت مناسب ہے، اور اِس راہِ درویشی میں بڑے نکتے ہیں۔ یہ لباسِ وجود جسے جسم کہتے ہیں مستعار ہے، مستعار لباس کو پاک و صاف رکھنا چاہیئے۔ اور روح جو تمھاری ذات پر دلالت کرتی ہے اُسے این و آں کے علائق میں نہ پھنسنے دو۔ (المصنفہ) ؎

پاسِ جاں کن تن ندارد اعتبار
قالبِ خاکی مزارے بیش نیست[1]

---

[1] (مطلب) جان (روح) کی احتیاط کرو، جسم کا تو کوئی اعتبار نہیں ہے یہ مٹی کا قالب ایک مزار سے زیادہ نہیں۔ (ن۔ا۔ف)

اپنے اوپر نہ دیکھو بلکہ اپنے اندر دیکھو، خدا پر نظر رکھو اور توکل کرو۔ نیاز پیدا کرو، کہ نماز ہی ہمیشہ کام نہیں آتی، گداز پیدا کرو، کیونکہ بے گداز دل کسی مصرف کا نہیں۔ غرور کرنا عیب ہے، اپنے تمام کام خدا کو سونپ دو۔ جو تم سے زیادہ زبوں حال ہے، اُسے بھی ہلکی نظر سے نہ دیکھو، غرور سخت معیوب ہے، خبردار اس سے مُنھ پھیر لو۔ نیازمندی کی عادت ڈالو تاکہ دِلوں میں گھر کرسکو، جہاں تک بن پڑے دنیا کے بکھیڑوں سے بچو، بیکار اپنے اوپر یہ بوجھ نہ رکھ لو۔ دل کو ماسوا کی یاد سے پاک رکھو، جب تک گھر صاف سُتھرا نہ ہو مہمان کے قابل نہیں ہوتا۔ ہر موافق و ناموافق سے نبھاؤ جب تک آدمی اخلاق پیدا نہ کرے انسان نہیں بنتا۔ ہر شخص سے سلوک سے پیش آؤ کہ یہی درویشی ہے۔ پردیسی کی طرح رہو کیونکہ سفر درپیش ہے۔ یہ عالم امتحان گاہ ہے اس جگہ زیادہ دیر تک ٹھیرنے کی رسم نہیں۔ یہ دنیادار ماتمی ہیں، اِن کی تسلّی کے لیے کوئی دم ٹھہر جاؤ۔ یہ ایک خوفناک جنگل ہے جہاں سانپ اور چیونٹی بھی پھونک پھونک کر چلتے ہیں۔ زادِ راہ کی فکر کرو کیونکہ معلوم نہیں قافلہ کب چل کھڑا ہو، اگر تم چاہتے ہو کہ صحیح سالم نکل جاؤ تو اِس بیمار گھر میں حکیمانہ پانی پیو اور پرہیزی کھانا کھاؤ۔"

(نکتہ) فقیر وہ ہے کہ جو اُس کے پاس ہے وہ اُس کا بھی محتاج نہ ہو اور غنی وہ، کہ مملکتِ عدم بھی دوسرے کو دے ڈالے۔ ہمارے لیے فقیری ہے۔ اَللّٰہُ الغنیُّ وَاَنتُمُ الفُقَرَاءُ (غنی صرف اللہ کی ذات ہے اور تم سب فقیر ہو) جان لو اِس چمن میں ایک ہی گُلِ تر ہے جو ہزار رنگ میں جلوہ گر ہے، یعنی معشوق ایک ہی ہے، لیکن اُس کے جلوے بے شمار ہیں ؎

معشوق درحقیقت، گر بنگری یکے است ہر کس بجلوۂ دلِ خود شاد می کند [1]

---

[1] اگر تو غور سے دیکھے حقیقت میں معشوق ایک ہی ہے مگر اُس کے جلوے بے شمار ہیں۔ ہر شخص اپنے مذاق اور رجحان کے موافق کسی جلوے سے اپنا دل خوش کر لیتا ہے۔ (ن۔ا۔ف)

یکے را ببیں دیکے را بداں
یکے را بجو دیکے را بخواں ؎۱

دوئی کجاست، ز نیرنگ احولی بگزر
کہ یک نگاہ، میانِ دو چشم مشترک است ؎۲

جاؤ کچھ کھاپی کر آرام کرو، سفر سے تھکے ماندے آرہے ہو ذرا دیر کے لیے پانو پھیلا کر لیٹ جاؤ تم نے بہت زحمت اُٹھائی ہے۔" پھر ایک نوکر کو اشارہ کیا کہ اُن کے آرام کا بہت خیال رکھے، اور کسی وقت بھی اُن کی خدمت سے غافل نہ رہے۔

غرض کہ وہ سیّد زادے دل جمعی کے ساتھ رہنے لگے۔ میرے والد اُنھیں "برادرِ عزیز" کہہ کے پکارتے تھے۔ وہ بھی صبح و شام درویش کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کسبِ کمال کرتے تھے والد ایک لمحے کے لیے اُن کی دل جوئی سے غافل نہ تھے، ہر روز مقاماتِ درویشی کا ایک نیا باب اُن پر کھول دیتے تھے۔ تھوڑی ہی مدت میں یہ درویشِ کامل ہوگئے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ پلک جھپکاتے تو ہزار ہا عجائب ظاہر ہوتے اور ذرا ارادہ کرتے تو کرامت نمایاں ہو جاتی۔ جب اُن کے دوست احباب تک یہ خبر پہنچی، وہ وطن سے بڑے اشتیاق کے ساتھ آئے۔ اُن کی بیوی دق کے مرض میں گرفتار ہوگئیں اور کچھ دنوں بعد اِس دنیا سے چل بسیں۔

؎۱ اس کائنات میں ایک ہی خدا کو دیکھ اور ایک ہی کو جان، ایک ہی کی تلاش کر اور ایک ہی کو آواز دے۔

؎۲ دوئی کہاں ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کانے آدمی کو ایک کے دو نظر آتے ہیں، حالانکہ ایک ہی نگاہ دو آنکھوں کے درمیان مشترک ہے۔ (ن-ا-ف)

القصہ اُن کی درویشی کا چرچا ہوا اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا تو اُنھوں نے لوگوں سے ملاقات کرنے میں مصلحت نہ دیکھی اور گوشہ گیر ہو گئے۔ جب اِسی حالت میں ایک سال بیت گیا تو والد نے کہلا بھیجا کہ اب دنیا والوں کے لیے اپنے فیض کا دروازہ کھول دینا چاہیئے۔ ایک شام اپنے حجرے سے باہر نکلے، اِس انداز سے کہ فرشتوں کو رشک آئے۔ درویش (میرے والد) کو سلام کیا اور قدموں پہ گر گئے۔ (والد صاحب نے) فرمایا: "بڑے باہمت مرد ہو اور تم نے یہ بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ 'ہوس' اور 'نفس' دونوں انسان کے دشمن ہیں، ہوس انسان کو کتے کی طرح سرگرداں رکھتی ہے اور نفس اُسے مغرور و سرکش بنا دیتا ہے۔ تم نے قناعت کا پتھر پیٹ سے باندھ کر نفس کو زیر کر لیا ہے ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

میں اُن دنوں سات سال کا تھا۔ اُنھوں نے مجھے اپنے سے مانوس کر لیا، اور گود لے لیا تھا یعنی مجھے میرے ماں باپ کے ساتھ نہ چھوڑتے تھے اور اپنا فرزند بنا لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنے پاس سے جُدا نہ کرتے، اور بڑے لاڈ پیار سے میری پرورش کرتے تھے چناں چہ میں دن رات اُن کے ساتھ رہتا اور اُن سے قرآن شریف پڑھتا تھا۔

عشق (نقل) ایک دن وہ جمعہ بازار کی سیر کو گئے تھے، وہاں اُن کی نظر ایک روغن فروش کے لڑکے پر پڑی جو ایک دولتمند جوان تھا، یہ اُس کی محبت میں دل کھو بیٹھے اور بے قابو ہو گئے۔ جب اُس لڑکے کی جانب سے التفات نہ پایا تو دل کی بے قراری اور بڑھی ہر چند یہ کوشش کرتے تھے مگر دل پر بس نہ چلتا تھا۔ نوکر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر زمین پر قدم رکھتے تھے تب کہیں راستہ چلتے تھے، اپنے دل سے کہتے "اے عزیز! ایسا کھیل کوئی بھی کھیلتا ہے جو تو نے کھیل کر اپنے تئیں کوچہ و بازار میں رُسوا کرا دیا۔ یا تو

ضبط و استقامت کا وہ عالم تھا، یا یہ بے اختیاری و بے قراری ہے، جو حرکت تو نے کی ہے وہ ایک بچّہ بھی نہیں کرے گا، جس سے راستے پر تو چلا ہے اُس پر اندھا بھی نہیں چلتا۔ دل ایسی چیز تو نہ تھی کہ ایک بازاری لونڈے پر نچھاور کر دی جائے۔ تو ایسے لڑکے کی محبت کا اسیر ہوا ہے جو کبھی دھوپ چڑھے گھر سے باہر بھی نہ نکلا اور ایسے کا تو دیوانہ ہوا ہے جو دل کے لیے قدم بھر بھی نہیں چلا۔ آنکھیں اور بھی رونے لگی ہیں گویا منتظر تھیں کہ کسی کو دیکھیں اور دل دے بیٹھیں، دل اور بھی زیادہ تڑپ رہا ہے جیسے بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ میری آنکھ لڑی اور تڑپنے لگا۔ آنکھوں کی کہاں تک روک تھام رکھوں اور دل کو کیسے قابو میں لاؤں، کبھی عالمِ جوانی میں کسی پر آنکھ نہ کھولی تھی۔ اب نوجوانوں کی تقلید کر رہا ہوں۔ اگر خود کو سمجھاتا ہوں تو دل تڑپ تڑپ کے قیامت ڈھاتا ہے، اور ضبط کی کوشش کرتا ہوں تو آنکھیں رو رو کر طوفان اُٹھاتی ہیں، حیران ہوں کیا تدبیر کروں کہ یہ گتھی سُلجھے۔ اب پیر و مرشد کی توجّہ کے سوا چارہ نہیں، جو کچھ بھی ہو، اُن کی خدمت میں جاکر بیٹھتا ہوں۔

چناں چہ اِسی حالِ تباہ سے آنکھوں میں اشک اور لبوں پر آہیں لیے ہوئے، مغرب کی نماز کے قریب نوکر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر درویش کی خدمت میں آئے۔ حاضرین نے تعظیم کی، درویش نے اشارہ کیا، انھیں صدر میں جگہ دی گئی۔ تو والد نے کہا "ارے بھائی کہاں تھے؟ آج بڑی دیر میں صورت دکھائی۔" اُنھوں نے عرض کیا "جمعہ بازار کی سیر کرنے گیا تھا!" فرمایا: "تم نے شاید یہ نہیں سُنا تھا؟ (المصنف) ؎

مستمندِ عشق می داند کہ سودا می کند   دیدنِ طفلانِ بازار رُسوا می کند [1]

---

[1] (ترجمہ) عشق کا گرفتار ہی جانتا ہے کہ بازاری لڑکوں کا دیکھنا رُسوائی کا سبب ہوتا ہے، اور جنون پیدا کرتا ہے۔ (ن۔ا۔ف)

جاؤ اب اپنے حجرے سے آٹھ دن رات تک باہر نہ نکلنا، اور اس داستان کا ہرگز اعادہ نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کریم ہے شاید اُس لڑکے کو پہنچا دے اور تمھاری لاج رکھے!"

اتفاق دیکھیے، ابھی ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ شام کے وقت وہ چودھویں کا چاند (لڑکا) اپنے گھر سے نِکلا اور سراسیمہ و بیتاب سا دکان پر بیٹھ گیا۔ دکان کا دلاّل بھی وہیں کھڑا تھا اُس نے پوچھا "کیا بات ہے؟ آج تمھارا رنگ ہی بدلا ہوا ہے اور بہت بے چین نظر آتے ہو" لڑکے نے کہا "کیا بتاؤں جو دل پر گزر رہی ہے، زبان تک نہیں لا سکتا۔ مگر تجھے ہمدرد سمجھ کر بتا دینے میں مضائقہ نہیں، آج چھٹا دن ہے ایک درویش اِس راستے سے گزرے تھے اُن کی نگاہ میری رعنائی پر پڑی، کچھ دیر وارفتگی کے عالم میں کھڑے رہے میں نے غرور و تمکنت سے اُن کی جانب التفات نہ کیا تو ناچار وہ جلے دل سے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر چلے گئے۔ وہ دن تھا اور آج کا دن ہے، اُن کی صورت میری نظروں کے سامنے سے جُدا نہیں ہوتی نہ دل سے اُن کا خیال جاتا ہے، سوتے جاگتے اُنھیں کا تصوّر اور اُنھیں کی یاد ہے۔ کیا کروں؟ دل کو کیسے بہلاؤں؟ اُن کا نام کس سے پوچھوں؟ پتا کہاں دریافت کروں، راستہ کیسے طے کروں، اپنا غم کس سے کہوں؟" دلاّل نے کہا۔ وہ تو بہت مشہور بزرگ ہیں نہایت منکسر مزاج، ایک خلق اُن کے آستانے پر ماتھا ٹیکتی ہے، ایک عالم اُن کا مرید ہے۔ وہ سیّد علی متقیؔ کے چھوٹے بھائی ہیں، جو درویشی و بزرگی میں اِس آسمان کے نیچے یکّہ و تنہا اور مشہور آفاق ہیں، اُن کا آستانہ جس کی خاک تبرّک کے طور پرلے جاتے ہیں شہر پناہ سے باہر عیدگاہ کے قریب ہے تم میرے ساتھ آؤ اور غم سے چھٹکارا پاؤ" غرض وہ فرمایہ (دلاّل) اُس لڑکے کو میرے والد کی خدمت میں لایا۔ اُنھوں نے حقیقتِ حال سُن کر فرمایا "آخر عشق کی بے نیازی نے تغافل کا انتقام

لے ہی لیا!" ایک ملازم کو حکم دیا کہ "جا کر برادرِ عزیز سے کہہ دے کہ آؤ تمھارا محبوب تمھیں ڈھونڈھتا ہے۔" جب یہ حکم، اِس خوش خبری کے ساتھ اُس جگر خستہ گوشہ نشین کو ملا تو کلبۂ احزاں سے دست افشاں و پا کوباں باہر آئے۔ پہلے پیر و مرشد کے قدموں میں سرِ نیاز پابوسی کے لیے جھکایا پھر دستِ شوق لڑکے کی جانب بغل گیر ہونے کے لیے بڑھایا، یعنی دل کی خواہش کے مطابق اُسے سینے سے لگایا اور اپنی تمنا کے موافق اُس نخلِ مُراد کو دیکھا!

والد نے دونوں کو اجازت دی کہ علیٰحدہ بیٹھ کر بات چیت کر لیں۔ جب باتیں چھڑیں تو درویش (میر امان اللہ) نے کہا "اے جوانِ رعنا، میں فقیر ہوں اور بے مدّعا دل رکھتا ہوں۔ مجھے اپنی زلف کا اسیر نہ سمجھنا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ دل کہاں پھنسا ہوا ہے اور یہ سراپا خواہش جان کس کی آرزومند ہے، خبردار! تو مغرور نہ ہونا اور ناز نخرے نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ افسوس کرے۔ درویش لوگ اگرچہ دائرہ آسمان سے باہر ہیں (یعنی عامتہ الناس سے مختلف ہیں) لیکن اُنھیں بھی ایک حال میں نہیں چھوڑا جاتا یعنی ہم لوگوں کا حال مختلف ہے۔ اچھا اب جاؤ، تم نے بہت رنج اُٹھایا ہوگا۔"

لڑکے نے کہا "میں نے رنج تو اُٹھایا، مگر گنج پا لیا ہے۔ اب میں اِس آستانے کی جاروب کشی کو فخر سمجھتا ہوں، اُمید ہے آپ مجھے محروم نہ فرمائیں گے اور میرے حال پر عنایت کی نظر رکھیں گے۔ پھر وہ ہر روز صبح آکر بیٹھتا اور دل و جان سے خدمت کرتا تھا۔

ایک دن درویش (میر امان اللہ) خاص کیفیت میں بیٹھے تھے، وہ نوجوان بھی اُس وقت آگیا۔ "جوانِ عزیز" کہہ کر آواز دی اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ اُس پر ایسی توجّہ کی نظر فرمائی کہ وہ اپنے مقصودِ دلی کو پا گیا، اور "جوانِ عزیز" ہی کے لقب سے عالم میں مشہور رہا۔ شہر کے بڑے لوگ اُس کی عزّت کرتے تھے۔ دوسرے خاص مرید رَشک

کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ آخر اس پر ایسی حالت طاری ہوئی کہ میدانِ طریقت میں سب پر بازی لے گیا۔ سچ ہے، اگر درویشوں کی نظر اثر کرتی ہے تو ناچیز مٹی کو سونا بنا دیتی ہے۔

احسان اللہ

(حکایت) درویشِ جگرریش، یعنی میرے عمِ بزرگوار (میر امان اللہ) ہفتے میں ایک بار، احسان اللہ نامی ایک فقیر سے جو ایک مردِ آزاد تھے، ملاقات کرنے جایا کرتے تھے، آگرے میں عیدگاہ کے اُس پار ایک محلّہ "فقیر کا تکیہ" تھا وہاں اُن کا صاف سُتھرا، بلند چار دیواری کا مکان تھا۔ جس کے دروازے پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

خاطرِ آسودہ خواہی، راہِ آمد شد بہ بند
چاک در پیراہنِ دیوار از دستِ در است ؎[1]

جو کوئی اُن کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور آواز دیتا، تو خود آتے اور جواب دیتے "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے جلدی جاؤ، یہ گھر خالی ہے"۔ ایک بار میرے چچا نے اُن سے ملاقات کا ارادہ کیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ جب دروازے پر پہنچے تو وہی جواب ملا یعنی "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے"۔ چچا نے کہا "اگر احسان اللہ نہیں ہے تو امان اللہ ہے!" ہنسے اور دروازہ کھول دیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ ایک گٹھے ہوئے متناسب جسم کا جوان ہے خورشید سوار! جس کی پیشانی سے ہیبتِ حق نمودار ہے۔ اکہری چادر اُوڑھے، لنگی باندھے، اور نہایت پُرہیبت

---

[1] (ترجمہ) اگر تجھے اطمینانِ قلب درکار ہے تو آمد و رفت کے راستے بند کر دے۔ (یعنی لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لے) دیوار کے پیراہن میں چاک دروازے ہی کی وجہ سے ہے۔ (یعنی زیادہ میل جول یادِ الٰہی میں قلب کو یکسو نہیں ہونے دیتا)۔ (مترجم)

سُرخ آنکھیں! گویا شیر عشق الہٰی سے اُن کے در پر سویا ہوا ہے۔ مصافحہ ہوا، اور پہلو کے سائے میں بیٹھ گئے، ایک دوسرے کی مزاج پُرسی کی۔ فرمانے لگے: "اے میر امان اللہ میں نے گوشہ نشینی اس لیے اختیار کی ہے کہ صحبت کے لایق انسان نہیں پائے۔ تمھیں دل بہت چاہتا ہے جب تک تم نہیں آتے برابر خیال رہتا ہے۔ اور ہاں، یہ بچّہ کس کا ہے؟" چچا نے کہا "علی متقّی کا لڑکا اور میرا گود پالا ہے۔" فرمایا "یہ بچّہ ابھی کم سِن ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، اگر اِس کی تربیت ڈھنگ سے ہو گئی تو ایک ہی جست میں آسمان سے بھی پرے پہنچے گا۔ اِس سے کہو کہ درویشوں کی ملاقات کو اپنا معمول بنائے، فقیروں کی صحبت بڑی بابرکت ہوتی ہے۔" پھر پانی میں سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا بھگو کر کھانے کے لیے مجھے دیا۔ میں نے ایسی لذیذ غذا کبھی نہیں کھائی، مجھے اب تک اُس کا ذائقہ یاد ہے۔

درویش کے ارشادات

(نکتہ) فرمانے لگے کہ اے یار اللہ کی معرفت اِس صحرائے پُرغبار (دنیا) میں ایک غزالِ وحشی ہے، انسان کا جسم گھوڑا، اور رُوح اُس کی سوار ہے۔ اگر یہ غزالِ وحشی صید ہو جائے تو گھوڑے کے ضایع ہونے سے کیا بگڑتا ہے! ہاں اگر گھوڑا مر گیا اور شکار ہاتھ نہ آیا تو ایسی حسرت رہے گی کہ کوئی عذاب اُس سے زیادہ دردناک نہ ہوگا اِسی کو عذابِ قبر کہتے ہیں۔

(موعظت) آؤ، غرور و ہوس سے بچ کر نکل جاؤ۔ نفسِ امارہ ذلیل و آوارہ کتا ہے، تم اُس کے کہنے پر چلے تو ٹوٹے میں رہوگے، اگر ریاضت و کوشش کر کے خودی سے گزر گئے تو سمجھو انسانیت کی منزل تک پہنچ گئے۔ بے سمجھ لوگ طولِ امل کی برائیوں کو نہیں سمجھتے مگر عقلمند اپنے لیے خود ہی پھانسی کا پھندا نہیں بناتا۔

(نکتہ) یہ آسمان ایک طلسماتی پردا ہے جس سے عجیب و غریب شکلیں اور صورتیں

نمودار ہوتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ یہ آنا اور جانا شکل و صورت کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اس کارخانے کا چلانے والا تو کوئی اور ہی ہے۔ دنیا سے ہرگز دل نہ لگاؤ یہ تو ایسی بے شرم طوائف ہے کہ باپ چلا جاتا ہے تو بیٹے سے ہم بستر ہو جاتی ہے۔ نیک سیرت اور باحیا لوگ اِس کی طرف مطلق توجّہ نہیں کرتے۔

(فقیرانہ باتیں) ریاکار لوگ اِس بے حقیقت زندگی میں جو پلک جھپکاتے تمام ہوتی ہے، کیسے بھُولے بیٹھے ہیں اور عناصر کی اِس چاردیواری میں جسے دنیا کہتے ہیں اور جس سے جلد ہی گزر جانا چاہیئے، اقامت کو جاودانی سمجھ کر کیسی فراغت سے آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔ وہ ظاہر میں کتنے ہی ہشیار نظر آئیں لیکن بے خبر ہیں یعنی اُنھیں حقیقت کا علم نہیں، اُن کے دِلوں میں کدورت کے سِوا کچھ نہیں، ایسوں کی صحبت میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔ صحبت کے قابل تو وہ بے نوا درویش ہیں جو کسی درخت کا سایہ بھی اپنے اوپر بار سمجھتے ہیں (یعنی دنیا میں بے فکری اور آرام طلبی سے کہیں نہیں بیٹھتے بلکہ دنیا کی حقیقت سمجھ گئے ہیں اور اپنی طلب میں محو ہیں) یا وہ برہنہ تن فقیر جو ذاتِ خداوندی میں جذب ہو گئے ہیں۔ یا وہ پہلوان جو نفسِ امّارہ سے جہاد کرتے ہیں یا وہ درویشانِ جگرریش جو یار و خویش سے بھی بیگانے ہیں، جن کے سرِ نیاز بارگاہِ خداوندی میں جھکے ہیں اور دل پانی کی طرح پاک صاف ہیں۔ بیشۂ فقیری کے یہ شیر خونِ دل پیتے ہیں۔ بحرِ بے جوش اور طوفانِ بے خروش ہیں۔ کوچۂ محبّت کی خاک بن گئے ہیں، بیابانِ وحشت میں دھونی رمائے ہوئے ہیں، وہ خدا سے واصل ہیں۔ سب سے دور ہیں مگر دل سے نزدیک ہیں، جلوۂ یار کے متوالے ہیں، معشوق کے سایۂ دیوار کے خاک اُفتادہ، بحرِ حقیقت کے شناور، اور میدانِ طریقت کے یکہ تاز ہیں۔ ایسے آوارگانِ منزل رسیدہ ہیں جن کے سائے سے آفتاب روشن ہوتا ہے۔ خاک نشیں ہیں، مگر فلک پر پہنچ گئے ہیں،

گوشہ نشیں ہیں مگر خلق میں معروف و مقبول ہیں! وہ صحرائے عشقِ الٰہی کے دیوانے اور گلشنِ حیا کے پھول، سر کے نیچے سخت پتھر رکھتے ہیں۔ عشق کے علامات اُن پر ظاہر ہیں، پیٹ سے پتھر باندھتے ہیں، مگر شکایت نہیں کرتے۔ طامع و حریص نہیں ہوتے، لذیذ کھانوں کی طرف نہیں جھپٹتے، رُوکھی سوکھی کھا کر ہی خوش ہو جاتے ہیں!

وہ عجب زرد رُخسار اور عشق کے پُرانے بیمار ہیں، مزاج کے ایسے غیور کہ جس کے دیکھنے کے لیے مرتے ہیں اُسی کی طرف نہیں دیکھتے۔ سر میں وہ غرورِ عشق رکھتے ہیں کہ جب تک معشوق کی تیغِ ناز نہ بٹھا دے خود نہیں بیٹھتے۔ محبوبِ حقیقی کو جس سے وہ اتحاد رکھتے ہیں، کمالِ ذوق و شوق سے دن رات تلاش کرتے ہیں! وہ ایسے جنگ آور ہیں کہ اُنھوں نے بہتّر فرقوں سے صلح کر لی ہے اور ایسے کیمیا گر ہیں کہ ناچیز خاک کو ہزار بار سونا بنا دیا ہے۔ درویش اِس کارخانۂ ہستی میں متصرّف ہیں، یعنی جو کچھ ہیں وہی ہیں، جو چاہو دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دے سکتے ہیں، یہاں تک کہ حاصلِ ہر دو جہاں جو چیز ہو، وہ بے تکلّف مرحمت کر سکتے ہیں! ایسے بزرگوں کا ذِکر کرو، اور اُن سے ہمّت طلب کرو، بنو تو ایسے بنو۔ حقیقت کے دریائے عظیم کا راستہ بند ہے مگر اُس کی کنجی درویشوں کی زبان ہے۔ پانی پر جانماز پھینک کر بے کھٹکے چلنا ایسے ہی درویشوں کا تصرّف ہے!"

اتنے میں شام ہو گئی، فرمایا: "اے یارِ عزیز، مغرب کی نماز کا وقت آ گیا، اگرچہ تمھیں رخصت کرنے کو دل نہیں چاہتا لیکن طلوع و غروبِ آفتاب سے قبل خشوع و خضوع کا وقت ہوتا ہے۔ اِس وقت بیٹھنا نہیں چاہیے۔ جاؤ، علی متقی سے میرا اسلام کہہ دینا۔"

ہمیں رخصت کر کے دروازہ بند کر لیا۔ چچا نے وہاں سے آ کر اُن کا سلام میرے والد کو پہنچایا، اُنھوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے سلام قبول کیا اور فرمایا کہ "احسان اللہ

کی ملاقات کو اللہ کا احسان سمجھنا چاہیئے۔ اب جاؤ تو میرا بھی سلام کہنا۔ چوتھے دن چچا پھر اُن کے گھر گئے، میں بھی ساتھ تھا دستک دی، وہی جواب ملا "گھر میں نہیں ہوں"۔ چچا نے فرمایا: "اگر تم نہیں ہو تو کون ہے جس نے میرے دوست کے گھر میں جگہ بنالی ہے!" احسان اللہ ہنسے اور دروازہ کھول دیا۔ اُن کی صحبت میں بڑی برکت و سعادت حاصل ہوئی، بڑے قابلِ قدر ارشادات سُننے اور بے اندازہ لُطف و عنایات سے مالامال ہونے کا موقع ملا۔

فرمایا "اے عزیز جب سے عشق نے مجھے ٹھکانے لگایا ہے اور محبت کا نقش میرے دل میں بیٹھا ہے، کوئی چیز نظر میں نہیں جچتی، اور دل کو دنیا سے قطعاً لاگ نہیں رہی ہے۔ تجرّد پیشہ ہوں، بے اندیشہ ہوں، اگر سارا عالم درہم و برہم ہو جائے تو بھی میری جمعیتِ خاطر پراگندہ نہ ہوگی، اگر آسمان بھی زمین پر گر پڑے تو میرا دل منتشر نہ ہوگا۔ جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو اُس کا جلوہ دیکھتا ہوں جو سورج مکھی سے زیادہ نازک ہے، ایک نگاہ سے رنگ ہی بدل دیتا ہے، اور جب سر بگریباں ہوتا ہوں، اُس کا تماشائی بن جاتا ہوں جس کا جلوہ برق سے ہزار درجہ شوخ تر ہے، یعنی ایک پل کے لیے بھی میرے دل کو تسلّی نہیں دیتا۔ میرا محشر خرام محبوب اگر رفتار میں آوے تو عالم تہ و بالا کر دے، میرا بلند و بالا دل بر کھڑا ہو تو قیامت برپا کر دے! اگر تم اُس کے کوچے کی خاک بن جاؤ تو سب سروں کے تاج بن جاؤ۔ اُس کے پائمال بنو تا کہ اہلِ نظر کی آنکھوں کا سرمہ بن سکو۔ ایسا دل لاؤ جسے وہ پسند کرتا ہے، ایسی جان پیدا کرو جو اُس سے واصل ہو جائے۔ کسی اپنے سے بہتر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دو، کیونکہ اِس طرح یہ دوُر دراز راستہ آسان ہو جاتا ہے، اور خبردار ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھ جانا کیوں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانے سے منزل پر پہنچنا کٹھن ہو جاتا ہے۔

(نکتہ) اے یارِ عزیز، موت ایک عجیب واقعہ ہے جو آنے والا ہے، اپنے احتساب سے غافل نہ رہو، یعنی خود کو دشمن کی نگاہ سے دیکھو کہ اصلی دوستی یہی ہے۔ ہشیار روح کا حال بدن سے مفارقت کے بعد ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی مست ہو معشوق درکنار، چونکہ اُس عالم میں تجددِ امثال[1] نہیں ہے، ایک طویل مدت کے بعد جب وہ مستی زائل ہو جاتی ہے جسے دنیا کی ہوس کہتے ہیں، پھر دفعتاً وصل کا لُطف پاتا ہے۔ افسوس ہے اُس جانِ ناآگاہ پر جو اِس دنیا سے دور ہو جاتی ہے اور اُس عالم سے بھی کوئی نسبت قایم نہیں کرتی بھرا ہاتھ ملتی رہتی ہے۔ ملال و مسرت کی اِنھیں دو کیفیتوں کو عارف دوزخ اور بہشت کہتا ہے۔

(موعظتہ) "اے یارِ عزیز! دل اگر غمگین ہے تو مبارک ہے، غم اگر دل گداز ہے تو اچھا ہے۔ (درویش) دلِ محزوں تلاش کرتے ہیں نہ کہ شایستۂ طرب! دردمند جان چاہتے ہیں نہ کہ درماں طلب۔ روئے نیاز اُس کی طرف رکھو جو بے نیاز ہے، سب کام اُسے سونپ دو جو کارساز ہے۔ گوشہ نشین ہو جاؤ اور توکل کرو، اپنے اندر کھو جاؤ اور غور و تامل کرو، اگر جان میں نیازمندی پیدا ہو جائے تو عنقا ہے۔ دل اگر گداز ہو جائے تو کیمیا ہے: (المصنف) ؎

مدعا نایاب و راہِ جستجو دُور و دراز
پا بدامن ہم نشیں، ناچاری باید کشید[2]

---

[1] تجددِ امثال: "یہ ایک سائنس کا مشہور مسئلہ ہے کہ جسم کے اجزا جلد جلد فنا ہوتے جاتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے نئے اجزا آتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد انسان کے جسم میں سابق کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا بلکہ بالکل ایک نیا جسم پیدا ہو جاتا ہے لیکن چوں کہ فوراً پرانے اجزا کی جگہ نئے اجزا آ جاتے ہیں اس لیے کسی وقت پہلے جسم کا فنا ہونا محسوس نہیں ہو سکتا۔" (سید عبداللہ: ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۳۲۰)

[2] (ترجمہ) ہمارا مدعا نایاب اور راہِ جستجو بہت دراز ہے، اِس لیے اے ہم نشیں گوشہ گیر ہو جانا ناگزیر ہے۔ (ن۔ا۔ف)

(نکتہ) اے یارِ عزیز، وہ یکتا پیرہن معشوق، جس رنگ میں چاہتا ہے نمودار ہو جاتا ہے، کبھی پھول ہے، کبھی رنگ، کہیں لعل ہے، کہیں سنگ۔ کچھ لوگ پھول سے جی خوش کر لیتے ہیں، بعض رنگ سے عشق کرتے ہیں۔ ایک جماعت لعل کو معتبر جانتی ہے تو دوسری پتھر کو خدا مانتی ہے۔ خبردار! کہ یہ غور کرنے کا مقام ہے۔ ایسی آنکھ ہونی چاہیئے کہ ماسوا کی طرف نہ اُٹھے، اور وہ دل درکار ہے جو اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ دشمن اور دوست سب اُسی سے ہیں، کیوں کہ دلوں پر اُس کا تصرف ہے۔ ہدایت اور گمراہی دونوں اُسی کا مظہر ہیں، مست اور ہشیار سب اُسی کو ڈھونڈھتے ہیں۔ محراب اُس کی ابروے پیدا ہوئی ہے، میخانہ اُس کی آنکھ سے ہویدا ہوا ہے۔ زاہدانِ مناجاتی عبادت و اطاعت کرتے ہیں، رندانِ خراباتی جام لنڈھاتے ہیں۔ محراب میں سر جھکانا چاہیئے اور خرابات میں رندانہ وضع سے آنا چاہیئے۔ یعنی ہر وضع کی رعایت اور مرتبے کا لحاظ ضروری ہے۔

(نکتہ) اے یارِ عزیز، ہستیٔ واجب (خدا) دلیل و برہان کی محتاج نہیں ؎

ہر کہ برحق دلیل می گوید
بچراغ آفتاب می جوید[1]

یہ بات تو اتنی ہی واضح ہے جیسے سورج نکلا اور دن پھیل گیا۔ اگر کوئی مالک و مختار نہ ہو تو آسمان گر پڑے، پہاڑ کھڑا نہ رہ سکے! نہ سورج چمکے، نہ چاند گردش کرے، نہ آگ جلائے، نہ ہوا موافقت کرے، نہ بادل برسے، نہ بجلی تڑپے، نہ پانی بہے، نہ گھاس اُگے، نہ پھول کھلے، نہ چمن ہنسے، نہ پھل پکے، نہ پیڑ پودے قائم

---

[1] (ترجمہ: جو خدا کے وجود پر دلیلیں بیان کرتا ہے وہ گویا سورج کو چراغ سے کر تلاش کرتا ہے۔

رہ سکیں۔

حق سبحانہ، تعالیٰ کو کریم کہتے ہیں اور اُس کی یہ صفت تمام صفات پر غالب ہے۔ لیکن اِس پر نظر کر کے بندگی و اطاعت کو ترک نہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ وہاں تو صاحبی ہے، جب وہ نوازتا ہے تو خاک کو آدمی بنا دیتا ہے اور بے نیازی دکھاتا ہے تو آدمی کو خاک کر دیتا ہے! ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم، جن کی شانِ مبارک میں کہا گیا ہے۔ "لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ" (اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا) تمام تمام رات نماز پڑھتے تھے اور اس قدر قیام فرماتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا تھا۔ دیکھنے والے کہتے "یا رسول اللہ آپ اتنی ریاضت کیوں فرماتے ہیں، آپ نے تو سارے عالم کو بندِ غم سے نجات دلادی ہے۔ حضورِ اکرمؐ تبسّم فرماتے اور ارشاد ہوتا "اور کیا کیا جائے؟ ہم تو بندے ہیں!" — تو میرے عزیز! بندگی اور صاحبی کا رشتہ بڑا نازک ہے۔ بندگی پیدا کر، تاکہ اپنے آقا کے سامنے شرمندگی نہ اُٹھاؤ۔"

یہاں تک بات پہنچی تھی کہ شہر کے صوبہ دار کا مصاحب آیا اور اُس کی درخواست پیش کی کہ نصرت یار خاں[1] قدم بوسی کے لیے حاضر ہو رہا ہے۔ درویش نے فرمایا: "خوش رہے، ہر چند وہ فقیروں سے ملاقات کا مُنھ نہیں رکھتا لیکن اب مجھے اس سے شرم آتی ہے، کئی بار بے لکام لوٹ چکا ہے، اس بار بھی واپس ہو گیا تو خدا جانے پھر ملاقات ہو یا نہ ہو" جب (صوبہ دار) دروازے پر آیا، ہاتھی سے اُترا اور دوڑ کر شرفِ پابوسی حاصل کیا، اور پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ احسان اللہ نے فرمایا:

---

[1] یہ نصرت یار خاں، محمد شاہی دور میں منصب دار تھا اور سیّد قاسم بارہہ (شہامت خاں) کا بھتیجا تھا۔ (مآثر الامرا) - وفات ۲۲ رمضان ۱۱۴۳ھ عمر ۶۰ سال (معاصرہ بحوالہ تاریخ محمدی، قلمی)

"خوب آئے اور اچھا لائے!" صوبہ دار نے عرض کیا "میری خوش بختی ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف پایا اور زیارت سے فیض یاب ہوا، دل کی مراد پوری ہوگئی" درویش کی جانب سے التفات دیکھا تو یہ بھی درخواست کی کہ "کبھی کبھی مجھ روسیاہ کو ایک نگاہِ کرم سے نوازتے رہا کیجیے"۔ احسان اللہ نے فرمایا "دل قوی رکھو، کہ تم خدائے عزّوجل کی طرف سے نوازے گئے ہو، یہاں سُرخ رو ہو تو اغلب ہے کہ قیامت میں بھی نوازے جاؤ، اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو، محتاجوں کی مدد کرو، بے مروّت اور سنگدل نہ بنو، بے کسوں کو ذلیل نہ کرو۔ خدا سے ڈرو۔ غرور نہ کرو، غریبوں کی حاجت روائی میں حیلے حوالے نہ کرو۔ درماندہ لوگوں سے ہرگز منھ نہ موڑنا ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن ذلیل کیے جاؤ۔ اچھا اب جاؤ کیوں کہ یہ یارِ عزیز (میر امان اللہ کی طرف اشارہ ہے) بہت نازک مزاج اور بے دماغ ہیں، میں ان کی پاس داری کے لیے مجبور ہوں۔ صوبہ دار نے نہایت اعتقاد سے اپنا ماتھا زمین سے لگایا، فقیر کے آستانے کو بوسہ دیا اور چلا گیا۔

احسان اللہ کی وفات

اسی دوران میں گویّے کا ایک لڑکا، گھونگھریالے بال، کتابی چہرہ، عودی رنگ، خوش گلو، کندھے پر سارنگی رکھے، کانوں میں سونے کے چھلّے پہنے، اُس طرف سے گزرا۔ فقیر کی نظر اُس پر پڑی، بے اختیار ہوگئے۔ میرے چچا سے فرمایا "اس کو بلا کر یہاں بٹھاؤ" وہ لڑکا آکر بیٹھ گیا اور بھیرویں میں یہ شعر گانا شروع کیا ؎

بیا کہ عمرِ عزیزم بہ جستجوے تو رفت　　ز دل نہ رفتی و جانم در آرزوے تو رفت[1]

---

[1] (ترجمہ) اے محبوب آجا، کہ میری عمرِ عزیز تیری جستجو میں گزر گئی، میری جان بھی تیری تمنا میں نکل گئی مگر تیری یاد دل سے نہ نکلی!

درویش کو وجد آ گیا، بہت محظوظ ہوئے۔ اُس سے فرمایا "اے عزیز آج رات فقیر کے ساتھ بسر کرو اور جو چیزیں تمھیں یاد ہوں، خود سناؤ"۔ لڑکے نے کہا "بسر و چشم یہ تو میرے لیے سعادت اور مجھ پر احسان ہے!"

شام ہو چلی تھی، ہمیں رخصت کر کے دروازہ بند کر لیا اور یادِ الٰہی میں بیٹھ گئے۔

پھر سنا گیا، کہ فقیر نے عشا کی نماز پڑھنے کا ارادہ کیا اور اشرفیوں کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ اس سیاہ دل گویّے نے بھانپ لیا، تھوڑی دیر کے بعد بازار گیا اور وہاں سے دودھ کے پیالے میں زہر ملا کر لایا۔ بڑے اصرار اور مبالغے سے درویش کو پینے کے لیے دیا، دودھ کا پینا تھا کہ درویش کی حالت دگرگوں ہو گئی، اُنھوں نے ہاتھ پاؤں پھینکنے شروع کیے، یعنی زہر اپنا کام کر گیا! وہ کم بخت ناہنجار اشرفیاں اٹھا کر چلتا بنا۔ آدھی رات کو درویش کی آہ آہ نے ہمسایوں کی نیندیں اُڑا دیں۔ گھبرا کر دوڑے تو درویش کو جاں بلب پایا۔ لوگوں نے اُس عیّار لڑکے کو بہت ڈھونڈھا مگر وہ رات کی تاریکی میں ایسا چھپ گیا کہ کہیں نظر نہ آیا۔ صبح ہوئی تو درویش نے جان آفریں کو جان سپرد کی۔ شہر کے سرکردہ لوگ انتہائی رنج و ملال کے ساتھ اُن کے جنازے پر آئے اور اُن کی وصیت کے مطابق 'فقیر کے تکیے' میں دفن کر دیا۔ اب تک وہ جگہ زیارت گاہِ خلایق ہے (المصنف) ؎

فلک زیں گونہ خوں بسیار کردست
عزیزاں را بے آزار کردست[1]

---

[1] (ترجمہ) آسمان نے ایسے کتنے ہی خون کیے ہیں، اور (خدا کے) پیاروں کو تکلیفیں پہنچائی ہیں!

فلکِ ناہنجار کے غمزے بھی نئے نئے ہیں اور ستم بھی الوکھے! آئے دن خاک نشینوں کو ستاتا ہی، ہر شب نیا فتنہ اُٹھاتا ہی، کسی کو زہرِ ہلاہل سے مارتا ہی، کسی کو تیغِ ستم سے گھائل کر کے خاک وخون میں لٹاتا ہی۔ محبت کے متوالوں کو چاہیئے کہ اس کی گردش سے بے خوف نہ رہیں تاکہ نقصان نہ اٹھائیں اور اپنی راہ سے بھٹک نہ جائیں!

بایزید (حکایت) میرے چچا کو درویشوں کی صحبت میں جانے اور اُن جگر فگاروں سے ملاقات کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن کسی سے سُنا کہ کوئی فقیر بایزید نام کے، سرائے گیلانی کے ایک حجرے میں جو عاشق کے دل کی طرح ہزاروں شگاف رکھتا تھا اور یہ سرائے بھی سیلاب سے ڈھے گئی تھی آکر ٹھیرے ہیں، وہ قابلِ زیارت ہیں۔ جب پتا لگا تو اشتیاق بڑھا اور سب طرف سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ مجھے چھوڑ کر، بھاگم بھاگ اُن کی خدمت میں گئے۔ دیکھا ایک جوان ہی، بلند بالا، نہایت مستغنی، گویا فرشتہ اِس دنیا میں آگیا ہی، نہیں نہیں جانِ آدم سے زیادہ عزیز، پتھر کا تکیہ، خاک کا بچھونا، ہر وقت ہلاک ہونے پر آمادہ، شکستہ دل، کشادہ رو، سوختہ جاں، دلدادہ، خاک اُفتادہ، متوکّل، اور مقصود دلی سے بہرہ مند، — اگر کوئی خوش چشم بھی اُس کے سامنے جاتا تو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے، کسی سے ملاقات نہ کرتے، بے کسی سے بسر کر رہے تھے۔ اکثر اوقات آنکھیں بند رکھتے، دل کسی وقت خدا کی یاد سے غافل نہیں تھا۔ روٹی کو رغبت سے نہ دیکھتے پانی بھی بہ مجبوری حلق سے اُتارتے۔ سخت کوشش اور باریک بیں تھے۔ قلندرانہ وضع کا لباس زیبِ تن تھا۔ چچا نے پوچھا "کیا نام ہی؟ اور کہاں رہتے ہو؟ دردمند اور عاشق پیشہ معلوم ہوتے ہو۔" چچا نے کہا "اِسی شہر میں رہتا ہوں، میرا امان اللہ میرا نام ہی" فرمایا "بیٹھ جاؤ"،

تمھارے ساتھ وقت اچھا کٹے گا" چچا کہتے تھے جب گفتگو شروع ہوئی تو بایزید نے بتایا کہ "اے عزیز، میں نے بڑی راہیں طے کی ہیں، بڑے رنج اٹھائے ہیں، خود سے بھاگا ہوں، گلی کوچوں کی خاک چھانی، ابر کی طرح اُٹھا، برق کی مانند گِرا، ایک عمر سرگرداں رہا، ایک مدت دل پریشاں پھرا، کچھ دن آنسو بہاتا پھرا، آوارۂ دشت و در رہا، راتوں کو نہ سویا، بہت دنوں کسی سے بات نہ کی، کبھی امیروں کا دامن پکڑا، کبھی فقیروں کے دروازے پر قیام کیا، تب کہیں اُس شوخ چشم کا گزر مجھ پر ہوا، اور اُس نے میرے حالِ تباہ پر نظر کی ؎

دیر بر بسرآں غزالِ رمیدہ گرد آمد مرا

از طپیدن ہائے دل پہلو بدرد آمد مرا [1]

اگر چاہتے ہو کہ اُس کی راہ میں سختی جھیلنے والے شمار کیے جاؤ تو فولاد کا دل اور پتھر کا کلیجا پیدا کرو!

(قیمتی باتیں) اے عزیز اگر وہ سراپا ناز محبوب آنکھوں کے سامنے ہو، تو یہی بہشتِ جاوید ہے، نظروں سے اوجھل ہو تو وہی عاشقِ ناامید کے لیے دوزخ ہے۔ یاد رکھو ہم پر کوئی بات روشن نہیں ہے۔ کچھ پتا نہیں کہ زاہدانِ ریاضت پیشہ کیا سمجھے ہوئے ہیں۔ اور اُس مستِ سرانداز کے بے خودانِ شوق کیا جانتے ہیں! ایک جماعت کو خواہش کی خلش ہے تو دوسری کو کاہش کا غم۔ مگر جو حق شناس ہیں وہ اُمید و یاس سے مبرا ہیں۔ جو خدا کے ہو گئے وہ اُس کی رضا جوئی کر رہے ہیں! عاشقوں کی جان کو تلخیوں سے واسطہ

---

[1] (ترجمہ) بڑی دیر کے بعد وہ غزالِ رمیدہ (محبوب) میرے پاس آیا، کہ دل کے تڑپنے کو میرا پہلو بھی درد کرنے لگا تھا۔ (میرزا رضی دانش)۔

ہے اور وہ بڑے اذیت جھیلنے والے ہیں، اگر تم راحتِ عقبیٰ حاصل کرنا چاہتے ہو تو رنج کو اپنے لیے گوارا بناؤ، سختیاں اُٹھاؤ تاکہ بفراغت دنیا سے گزر سکو، دنیا سے دل اُچاٹ رکھنا اچھا ہے، اگر معرفتِ حق میسر نہ بھی ہو، تب بھی یہ بُرا نہیں، دنیا تو برباد ہو جانے والی ہے اس کی بُنیاد وہم پر رکھی گئی ہے۔ آسمانِ نیلی فام ایک نہ ایک دن گرنے والا ہے کیونکہ اسے ہوا میں معلق کر دیا گیا ہے۔ اگر مقصود تک پہنچنا چاہو تو کسی دل میں راہ کرو اور جو کچھ خدمت تم سے بن پڑے، خدا کے لیے کرو۔ اگر تم دریا کے آشنا ہو اور تہ تک نہیں بھی پہنچ سکتے، تو کم سے کم کنارے ہی پر رہو، یعنی اگر لاکھ دم مرنے پر قدرت نہیں رکھتے تو جان دینے پر آمادہ ہی رہو! خود کو دیر و حرم کی قید سے بچاؤ، خدا کے بنو، چاہے جہاں رہو!۔

(فائدہ) عارفوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک جماعت کے لوگ تو نقشِ دیوار ہیں، گویا زبان ہی نہیں رکھتے، یعنی وہ صانعِ عالم کی صنعت گری اور پُرکاری سے حیران و ششدر ہیں، جو کچھ اُنھوں نے دیکھا ہے، دیکھا ہے، اور جو سمجھا ہے سمجھا ہے!۔۔ دوسری جماعت کے لوگوں کی زبان سے جو بات بھی نکلتی ہے وہ بادام کی طرح پُرمغز ہوتی ہے۔ یعنی اُن میں کا ہر ایک معشوق کی چشمِ سخن گو کے اشارے سمجھتا ہے۔ وہ جب جلوۂ دلدار کی تشریح کرنے پر آتا ہے تو ہزار ہزار رنگ میں بیان کرتا ہے۔ مژگانِ یار کی کیفیت دستو زبانوں سے ادا کرتا ہے۔ چناں چہ اُس مستِ ناز کے کمالات حدِ شمار سے زیادہ اور اس بے خود کے کلمات دائرۂ بیان سے باہر ہیں!"

یہ پہلی ملاقات تھی، جلد ہی ختم ہو گئی۔ فقیر کو زیادہ زحمت دینا مناسب نہ سمجھا؛ چچا نے میرے والد کی خدمت میں آ کر، اُن کا سارا احوال بیان کیا۔

والد نے کہا ع "ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است"۔ ہم مشرب درویش کہاں میسّر آتے ہیں، اُنھیں دیکھنے کے لیے اکثر جایا کرو۔"

پھر ایک دن عصر کی نماز کے بعد اُن سے ملاقات کرنے گئے، اِس بار مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ درویش نے بڑی عنایت اور شفقت سے استقبال کیا، اور اپنے سامنے بٹھایا، میں تو کم سِن تھا، چچا سے مخاطب ہوئے اور میرے بارے میں دریافت کیا۔ چچا نے بتایا: "یہ علی متقی کا فرزند ہے۔" فرمانے لگے: "اوہ پھر تم سے کیا پوچھنا، اِس بچے کے والد تو بڑے دانائے اسرار بزرگ ہیں، وہ آسمانِ درویشی کے خورشید مشہورِ جہاں، بلکہ جانِ درویشی ہیں، ایسا دریا ہیں، جس کی تہ سے قیمتی موتی نکلتے ہیں، ہم فقیر تو بے مایہ ہیں، ہم سے کیا بن پڑتا ہے۔ میاں لڑکے! میری طرف سے سلام نیاز کے بعد کہنا کہ یہ شوقِ بے پایاں کی کوتاہی نہیں جو اب تک خدمت میں حاضر نہ ہو سکا بلکہ شکستہ پائی اور بخت کی نایاوری ہے، جو چاہتا ہے کہ میں اِس خرابے سے قدم باہر نہ نکالوں، آپ بڑے بزرگ ہیں، میں آپ کی نسبت چھوٹا ہوں، مجھ ایسے بے مردِ پا کے لیے کسی خاص وقت میں دعا فرمایئے!"

پھر بات کا رُخ بدل کر، چچا کو مخاطب کیا کہ "اے عزیز! ہمہ تن گوش ہو کر فقیروں کی باتیں سنو!"

(نکتہ) "ہماری عبادت ہمارے ہی لیے ہے، وہاں تو خدائی ہے کسے پروا ہے؟ ہماری بندگی فقط یہ نہیں کہ اپنے اوپر بھول جائیں، اور خدا پر بھروسا کیے بیٹھے رہیں کہ اگر ہماری عبادت قبول ہو جائے تو احسان ہی احسان ہے۔ ہم تو بندے ہیں، اگر ہمیں کسی شمار قطار میں بھی نہ رکھا جائے تو بھی اِس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم

شرمندہ ہیں! یہ جو نفس نے تمھیں بہکا رکھا ہو کہ تم بھی کچھ ہو محض بدبختی ہی، جب اپنی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لوگے (تو اندازہ ہوگا کہ) کیسی محرومی ہی!

وہ سروِ نازا پنی ہی خوش خرامی پر فریفتہ ہی، اُس کی تجلیاں ہزار رنگ میں پیدا و پنہاں ہیں، تم نے کیا گمان کر رکھا ہی، کیا قرار دے لیا ہی، کس خیال میں ہو، کس سے دل لگایا ہی؟ وہ کبھی فتنے اٹھاتا ہی، کبھی عزت بخشتا ہی۔ خبردار! کسی دل کو ٹھیس نہ پہنچانا، کسی پر ستم نہ کرنا، دل کو عرش اِس لیے کہتے ہیں، کہ وہ اُس ماہ (خدا) کی خاص منزل ہی۔

نیازارم زخود، ہرگز دلے را
کہ می ترسم درو جاے تو باشد [1]

(نکتہ) اے عزیز، وہ محبوب، محبت پسند کرتا ہی یعنی عاشقوں کا دوست دار ہی اور تغافل کی شان سے، ان کے حال پر نظر رکھتا ہی۔ جب مراقب ہوتے ہیں وہ دل میں جلوہ گر ہی، آنکھ بند کرتے ہیں، تو سامنے ہی، اُسے جس در سے چاہتے ہیں آتا ہی جس رنگ میں ڈھونڈھتے ہیں جلوہ دکھاتا ہی۔ رنج اور خوشی اُن (عاشقوں) کی کیفیتوں کی تابع ہی، وہ خوش ہوتے ہیں تو چمن سے گرفتگی دور ہو جاتی ہی، غمگین ہوتے ہیں تو غنچے بھی نہیں کھلتے، لیکن ان کی باتیں جگ سے نرالی ہیں، کہ معشوق اُن کے پہلو میں ہی، مگر دل تمام خون ہی! کبھی فکر میں ہیں کبھی حیرت میں، قرار کسی دم نہیں، خدا ہی جانتا ہی کہ وہ خدا سے کیا چاہتے ہیں، کوئی خواہش نہیں رکھتے مگر گھلے جاتے ہیں!

(حکایت تمثیلی) کیا تم نے یہ واقعہ نہیں سنا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں کال پڑا، اور جانیں ضائع ہونے لگیں۔ لوگوں نے کہا، "اے موسیٰ! جنابِ باری

[1] (ترجمہ) میں اپنی جانب سے کسی کے دل کو آزار نہیں پہنچاتا، ڈرتا ہوں کہ اس میں تیرا مسکن ہوگا!

ہیں التجا کیجیے کہ بارش نہ ہونے سے مخلوق پریشان ہے، اور اس مصیبت کے جھیلنے کی تاب نہیں رکھتی۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر گئے، اور التجا کی۔ جواب ملا؛ "فلاں گھوڑے پر ایک مجذوب پڑا ہے، میں اس کی بڑی پسند کرتا ہوں، لیکن کچھ دنوں سے وہ آسمان کی طرف منھ نہیں کرتا، اور پہلے جیسی باتیں نہیں کرتا، پانی کا برسنا ہم نے اس کے بولنے تک موقوف کر دیا ہے!"

جب حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے جنابِ باری سے یہ جواب سنا، تو اسی گھوڑے کی جانب روانہ ہوئے اور اس دیوانۂ محبت کو پا لیا۔ دیکھا کہ ایک مرد مٹی کے ڈھیر پر سیاہ کمبل اوڑھے، پڑا ہے، سراپا شوق اور مستغرقِ دریاے عشق ہے، وہ دیوانِ تجرید کا مصرعِ یکتا اور جریدۂ تفرید کا فرد، حضرت موسیٰ سے دوچار ہوتے ہی بولا: "اے موسیٰ، اِس گھورے پر تمھارا گزر کیوں ہوا؟ دل کس سے اٹکا ہے جو اِدھر آنا ہوا؟" حضرت موسیٰ نے فرمایا: "بارش نہیں ہوتی، اور کسی کی دعا کارگر نہیں، میں نے باری تعالیٰ کی جناب میں التجا کی تھی، معلوم ہوا کہ تم نے سکوت اختیار کر لیا ہے اِس لیے انقباض ہے، جب تک عادت کے موافق باتیں نہ کرو گے، ہوا بادلوں کو نہ لائے گی اور بارش نہ ہوگی، خدا کے لیے تھوڑی دیر آسمان کی طرف منھ کر کے بیٹھ جاؤ تاکہ یہ بلا ٹل جائے۔"

اس مجذوب نے کہا: "اے موسیٰ، آپ نے اس فریبی کو نہیں پہچانا ہے اور نہ میری طرح اُس کی محبت میں دل ہارا ہے، اس عیار کی باتیں پہلو دار ہوتی ہیں اور اُس کے اشارے دل کو چکرا دیتے ہیں، استغفراللہ، میں اس کے کہنے پر کب راہ چلتا ہوں، ہاں اُس کے رسول کا لحاظ نہ کروں تو کافر ہو جاؤں اس لیے کہ:

باخدا دیوانہ باش و بانبی ہشیار باش!"

غرض کہ اُس عشقِ مطلق کے گرفتار، اور کمالاتِ حق کے حیران کار نے آسمان کی سمت منھ اُٹھایا، اور اپنے انداز میں کہنے لگا: "اے سراپا فریب، اے دشمنِ شکیب! اب سے پہلے تو بادل، ہوا، بارش سب کے سب تیرے تابع تھے اور اب یہ میرے فرماں بردار ہو گئے! اگر میں کہوں تو ہوا چلے گی، بادل آئیں گے، اور بارش ہوگی! ہاں، تو سچا ہے، بھلا تیرا کیا اختیار ہے، اِس کارخانے کا تو چلانے والا میں ہوں! بس یہ فریب دینا چھوڑ دے اور مخلوق پر رحم کر!" دو تین بار ایسے ہی فقرے کہے ہوں گے کہ ناگاہ ہوا چلنے لگی اور گھنے سیاہ بادل چھا گئے اور خوب ٹوٹ کے برسے۔

اے میرے عزیز، کون معشوق اپنے عاشق کا اتنا پاس کرتا ہے؟ افسوس ہے اگر تم اُس سے تعلق پیدا نہ کرو، اور اُس سرمایۂ جان کی طلب میں نہ مرو۔ دل اگر اُس کے لیے خون ہو جائے تو اچھا، اور جان اُس کی طلب میں چلی جائے تو بہتر ہے۔ اُس میں ایسے کھو جاؤ کہ اُسی کے رنگ میں (عین ذات بن کر) نمودار ہو جاؤ، اپنے تئیں یوں گم کرو کہ پھر نظر نہ آؤ۔ رباعی

نہ دل بخیالِ زلف و رخ باید داد　　نہ جاں بہوائے رنگ و بو باید داد

ایں جا دل را چہ قدر و جاں را چہ محل　　خود را ہمہ او کردہ باو باید داد [1]

---

[1] (ترجمہ) نہ تو دل زلف و رخ کی یاد میں دینا چاہیے، نہ جان، رنگ و بو، کی ہوس میں گنوانی چاہیے۔ یہاں دل کی کیا قدر اور جان کا کیا موقع ہے؟ خود کو سراپا محبوب (عین ذات) بنا کر اُسی کو سونپ دینا چاہیے۔ (یعنی ہستیٔ محبوب میں ضم ہو جانا ہی عشق کا کمال ہے۔)

اِسی دوران میں عصر کا وقت ہو گیا، ہم اُٹھے، اور اُن کے ساتھ نماز پڑھی، درویش نماز سے فراغت کے بعد مشرق کی سمت منھ کر کے بیٹھ گئے اور فرمایا: "اے میرا مان اللہ، آج میں نے وہ چیز کھائی ہے جو کبھی نہیں کھائی تھی اور اتنی لذیذ غذا کبھی نہ چکھی تھی۔" میرے چچا کچھ بے تکلف ہو گئے تھے کہنے لگے: "اے درویش، مبالغے اور تکلف کی بھی حد ہوتی ہے، آپ کا جسم تو فاقوں کے بوجھ سے جھک گیا ہے، پیٹ سے قناعت کا پتھر بندھا ہوا ہے، بارہ بارہ کوس آب و نان میسّر نہیں، نقاہت نے مرنے کے قریب پہنچا دیا ہے اور کس تباہ حالت سے اس ویرانے میں پڑے ہوئے ہیں، کہاں لذیذ کھانا، اور کہاں آپ! زیادہ باتیں نہ بنائیے!"

درویش نے کہا: "واللہ کہ میں بڑبولا اور زیٹ ہانکنے والا نہیں ہوں، جہاں جھوٹ کا احتمال ہو وہاں ٹھیرتا بھی نہیں۔ سنو! صبح سے بھوک کی دَوڑ لگ رہی تھی اور نفسِ شوم مضطرب تھا، یعنی چاہتا تھا کہ شہر جاؤں، اور کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلاؤں، لیکن میں سر کے نیچے پتھر رکھ کے لیٹ گیا، اور بہت جبر کر کے اپنی غیرت کو محفوظ رکھا، اتنی دیر میں، ایک چوہا آدھی سوکھی روٹی منھ میں دبائے ہوئے، اِس حجرے میں، جو دلِ عاشق سے زیادہ پارہ پارہ ہے، آیا، میں بظاہر فاقہ کشی سے بیمار بلّی کی طرح قاق، لیکن باطن میں شیر ہوں، جب اُس نے مجھے دیکھا تو وہ آدھی روٹی چھوڑ کر بھاگ گیا، مجھے کچھ خوشی ہوئی، اُٹھا، اور وہ ٹکڑا لے لیا۔ لیکن پانی نہ تھا کہ اُسے پاک کرتا۔ خضر کے انتظار میں تھا کہ اتنے میں سقّے کی آواز سنی، اپنا بے ہتھے کا کوزہ لے کر گیا، اور پانی لایا، اُس آدھی روٹی کو دھو کر پانی میں بھگویا اور کھایا۔ خدا گواہ ہے کہ اُس نے بہشتی نعمت کا مزہ دیا۔ — میرے عزیز، فقیروں

کی باتوں میں بناوٹ یا مبالغہ نہیں ہوتا' وہ شیخی خورے آسمان کے شاگرد نہیں ہیں کہ سَو کوزے بناتا ہے مگر ایک بھی سالم نہیں ہوتا' اِس گروہ کی صحبت میں پھکبتی کسنا' اپنے پانو میں کلہاڑی مارنا ہے' زبان کو لگام دے کر رکھنا چاہیئے' درویشوں کی رنجش بے ادبوں کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔"

چچا کو بڑی ندامت ہوئی اور اپنی بے ادبانہ باتوں کی معافی مانگی' معذرت کے بعد اُسی عنایت سے فرمانے لگے: "اے عزیز' میں تمھیں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں. لیکن یہ تنبیہ ضروری تھی کیوں کہ گستاخانہ بات منھ سے نکالنا آدابِ درویشی کے خلاف ہے۔" انھیں باتوں میں رات ہو گئی' ہم نے اجازت چاہی' فرمایا "خدا حافظ!"۔ وہاں سے آکر ہم نے والد صاحب کی خدمت میں درویش کا سلام اور پیام پہنچایا' فرمایا: "اُن کی عنایت ہے' اب اپنے چچا کے ساتھ جاؤ تو میرا سلام بھی ضرور کہہ دینا۔"

بایزید کی وفات

تیسری مرتبہ ہم اُن کی خدمت میں پہنچے تو بیمار پایا' ایک پہلو سے جھکے ہوئے کراہ رہے تھے' میرے چچا کو دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری' اپنے پاس بلایا اور شفائی کا یہ شعر پڑھا ؂

پرستارے نہ دارم بر سرِ بالینِ بیمارے
مگر آہے' ازیں پہلو بآں پہلو' بگرداند[1]

چچا نے دریافت کیا: "کیا بات ہے؟ جو آپ اتنا کراہ رہے ہیں!" کہنے لگے:

---

[1] (ترجمہ) بیماری میں میرا کوئی خدمت گار بھی نہیں ہے' بس اک آہ ہے جو اس پہلو سے اُس پہلو کو لٹا دیتی ہے! (حکیم شرف الدین شفائی)۔

"اے عزیز، سینہ ایسا پھُنک رہا ہے جیسے کوئی اندر آگ بھڑکا رہا ہو، آہیں جو بھر رہا ہوں، اسی آگ کی لپٹ، اور نالے جو کر رہا ہوں، اسی کے سرکش شعلے ہیں! ؎

من نمی دانم کہ دِل می سوزد از غم یا جگر
آتش اُفتاد است درجائے و دودے می کند ؂[1]

اگر موت میری فریاد سُن لے تو میرے لیے جنّت ہوگی، ورنہ یہ ایک دوزخ ہے، جو بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، اب تو جان کا نکل جانا ہی بڑی کامیابی ہے کیونکہ سانس کی آمدوشد بھی سوہانِ روح ہے۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام! کیا کروں؟ کون سی تدبیر ہو کہ موت آجائے اور قرار پا جاؤں ؎

روزے بشب کنم بصد اندوہ سینہ سوز
شب را سحر کنم، بامیدِ کدام روز؟ ؂[2]

ہوا جو چلتی ہے اُس آگ کو بھڑکاتی ہے، پانی جو پیتا ہوں تیل کا کام کرتا ہے، کوئی مناسب دوا موافق نہیں آتی، کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، اگر مجھے چمن میں لے جاؤ تب بھی اس سوزش سے بے چین ہی رہوں گا، اگر مجھے عمّان میں پھینک دو تب بھی یوں ہی پھُنکتا رہوں گا۔ کاش میرا سینہ چیر کر دل و جگر جلدی سے نکال لیں، یا مجھے یہاں سے لے جائیں اور زمین میں زندہ ہی دفن کر دیں!"

---

[1] (ترجمہ) میں نہیں جانتا کہ دل غم سے پھُنک رہا ہے یا جگر، بس ایسا ہے جیسے کسی جگہ آگ جا پڑی ہے اور وہ دھواں دے رہی ہے! (ساحر مشہدی)

[2] (ترجمہ) دن کو تو ایسی جاں سوز مصیبت کے ساتھ رات کرتا ہوں، اب رات کو کس دن کی امید پر صبح کروں؟

القصہ، اُس دل سوختہ و جگر کباب درویش کا حال زوالِ آفتاب تک یہی رہا، کبھی دیوار کے سہارے کھڑا ہو جاتا، کبھی بیٹھتا اور گر جاتا، کبھی آنکھیں کھول کر مایوسی سے دیکھتا اور کبھی ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا۔

ناگاہ میں نے کہا "ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" درویش بڑے خشوع و خضوع سے سر بہ سجدہ ہوا اور "سبحان ربی الاعلیٰ" کہتے ہوئے انتقال کر گیا ؎

آتشِ عشقش بسے را سوختست
لیک زیں ساں کم کسے را سوختست ؎

چچا، چند نوکروں کے ساتھ اُن کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہوئے اور اُسی بوسیدہ حجرے میں جو عاشق کے دل سے زیادہ شکستہ تھا، ان کو دفن کیا۔ میرے والد نے اُن کے انتقال کی خبر سن کر نہایت افسوس کیا اور فرمایا کہ: "ایسے انسان صفت مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، افسوس وہ بہت جلد گزر گئے۔"

(نقل) ایک دن وہی دل سوختہ درویش میرے چچا کو خواب میں نظر آئے، اور کہا "تم نے دیکھا؟ عشق نے میرے سینے میں کیسی آگ لگائی اور کیسا مجھے پھونکا۔ اِس کا موت کے سوا کوئی علاج نہ تھا۔ جب انھوں نے میری روح کی یہ بے تابی دیکھی تو مجھے اپنی رحمت کے بے پایاں سمندر میں ڈال دیا، اور مجھے گوہرِ مراد سے ہم کنار کر دیا، یعنی مجھے تسلی ہو گئی اور سکون مل گیا، دلی تمنا کے مطابق اُس نگار بہشت رو کا وصال میسر ہو گیا!"

؎ (ترجمہ) اُس کے عشق کی آگ نے بہتوں کو جلایا ہے، لیکن ایسا کسی کو کم جلایا ہوگا۔

یہ واقعہ دیکھ کر میرے چچا کے دل میں وحشت سی پیدا ہو گئی، مدت تک کسی چیز کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اکثر فرماتے: "بایزید عجب سوختہ جاں تھے، اُن کی جدائی کا داغ ایسا ہی کہ عمر بھر تازہ رہے گا"۔

برسبیلِ حکایت اُنھوں نے یہ خواب میرے والد سے بیان کیا، اُنھوں نے فرمایا: کیا تعجب ہی! خداوند تعالیٰ کریم مطلق ہی۔ تم نے یہ قصہ نہیں سنا'؟

(حکایتِ تمثیلی) مشہور عارف، حضرت بایزید بسطامیؒ[1] (رحمتہ اللہ علیہ) کے پڑوس میں ایک آتش پرست رہتا تھا، چالیس سال سے اُس کی حضرت بایزید بسطامیؒ سے واقفیت تھی۔ وہ ہر روز صبح سویرے تختے۔ بجا کر اپنی عبادت کیا کرتا تھا، اور روز ہی حضرت بایزیدؒ اُس سے فرماتے تھے کہ "اِس تختہ بجانے سے تیرے اوپر جنّت کے دروازے نہیں کھُلیں گے، اگر نجات کی خواہش ہی تو اسلام قبول کرلے"۔

ایک دن اُس کو خیال آیا کہ بایزیدؒ تنگی نہیں ہیں، جو مسلسل چالیس سال سے مجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دے رہے ہیں، یہ بات کسی فائدے سے خالی نہیں ہو سکتی، یہ سوچ کر اُن کی مجلس میں آیا اور کہا کہ: "اے شیخ، تم ہر صبح کہتے ہو کہ مسلمان ہو جا، میری نجات کی ضمانت بھی کر سکتے ہو"۔ حضرت بایزید بسطامیؒ اُس وقت حالتِ سُکر میں تھے، ایک کاغذ طلب فرمایا اور آتش پرست کو نجات کی ضمانت لکھ کر دے دی، وہ چلا گیا، اور مسلمان ہو گیا۔

---

[1] حضرت بایزید بسطامیؒ بڑے مشہور و معروف بزرگ گزرے ہیں، ۱۸۸ھ کو بسطام میں آپ کی ولادت ہوئی اور مابین ۲۶۱-۲۶۴ھ انتقال فرمایا۔ (مترجم)

اتفاق سے اُسی ہفتے میں وہ مرگیا، اور اُس کے وارثوں نے وصیت کے مطابق شیخ کی تحریر، کفن کے گریبان سے چپکا کر، اُسے دفن کردیا۔ جب شیخ کی حالتِ سُکر ختم ہوئی تو بہت متفکر ہوئے، ایک مرید نے تشویش کا سبب دریافت کیا، فرمایا "عالمِ بے خودی میں اک ایسا عہد کر بیٹھا ہوں، جس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا!"

مرید نے کہا: "جی ہاں، اُس وقت ایک آتش پرست آپ سے اپنی نجات کی ضمانت لکھوا کرلے گیا تھا، کہتے ہیں وہ مسلمان ہوا اور مرگیا۔" یہ سن کر شیخ کو غش آگیا اُن کے منھ پر پانی کے بہت چھینٹے دیے گئے تب کہیں ہوش آیا۔ فرمانے لگے: "مجھے اپنی ہی نجات کا تردد ہے، یہ جگر کہاں سے لاؤں کہ دوسرے کی ذمہ داری بھی اپنے سر منڈھ لوں!" گرتے پڑتے اُس نومسلم کی قبر تک پہنچے اور متوجہ باطن ہوئے۔ اُس کے معاملے میں دیکھا کہ وہی کاغذ ہاتھ میں لیے ہوئے، کہہ رہا ہے: "اے بایزید، تمھاری تحریر میرے کچھ کام نہ آئی، اس پرچے کے پیش کرنے سے پہلے ہی، جسے میں اپنی نجات کا پروانہ سمجھے بیٹھا تھا، اُس کریم نے مجھے اتنا قریب بلا لیا کہ مقرب فرشتوں کی نظریں بھی میرے معاملے کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں، تم اپنا دل پریشان نہ کرو، لو یہ رہی تمھاری تحریر، اسے لے جاؤ!"

جب ایسے بَدوں کو، اُس کا کرم، اِس طرح پالیتا ہے، تو وہ درویش (جنھیں میر امان اللہ نے خواب میں دیکھا تھا) پھر خوبانِ روزگار میں سے تھے، اگر وہ دریائے رحمت میں غوطہ زن نہ ہوتے تو یہ سارا ماجرا (بایزید کی بیماری) کس کام آتا؟"

کلماتِ معرفت (سخنانِ نغز) جب تم جانتے ہو کہ وہ سدا گلاب، ہزار رنگ میں جلوہ گری کرتا ہے، اور یہ چمن اُسی کا بنایا سنوارا ہوا، اور یہ رنگ

اُسی کے بھرے ہوئے ہیں تو اگر دیدہ ور ہو، غور کرو، قدم اُٹھاؤ تو دیکھ بھال کر اُٹھاؤ، کائنات کے تمام ذرّوں میں اُسی آفتاب کا عکس ہے، اگر تم اُس کی ادا پہچان گئے ہو تو تمھارا دل کامیاب ہے۔ جس کا دل اور آنکھیں روشن ہیں وہ جانتا ہے کہ حباب اور موج دریا ہی سے ہیں۔ حقیقت کا عرفان غافل کو نہیں ہوتا، اگر وہ غفلت میں پڑا رہے، ساحل پر کھڑا ہوا شخص، دریا کے بارے میں کیا جان سکتا ہے؟ آؤ، کہ ہم اٹھیں اور (تعینات و طلسمات کے) درمیان سے نکل جائیں، ہو سکتا ہے کہ مقصودِ دلی پالیں اور عین ذات بن جائیں۔

جوانی کا موسم بیت گیا، اور زندگی کا لُطف ختم ہو گیا، ساٹھ (۶۰) سال کی عمر ہونے آئی، بڑھاپا سر پر آن پہنچا، قد جھک گیا، طاقت زایل ہو گئی، دماغ ضعیف اور جسم نحیف ہو گیا، طبیعت سے روانی اور مزاج سے جَولانی مفقود ہو گئی، آنکھوں سے بصارت اور کانوں سے سماعت جاتی رہی۔ ذوق، بے ذوق ہو گیا، دانت کمزور ہو گئے، پانو ناتواں اور سر بے شور ہے، بال سفید ہیں، دِل نا اُمید۔ زیب و زینت چھوڑ دو، آرائشِ فقیری کا زمانہ گزر گیا، گوشہ نشینی اختیار کرو، زینتِ قلندری کے دن ہوا ہو گئے۔"

(نکتہ) "دنیا میں شہرت کا لحاظ کرو (یعنی جیسے کہلاؤ ویسے بنو) اور آخرت کے لیے عقل کی روشنی میں کام کرو یعنی ظاہر کو باطن جیسا پیش کرو اور باطن کو عقل کے مطابق سنوارو۔ اگر معشوق، حرم میں جلوہ گر ہے تو مسلمان ہونا ہُنر ہے، دل کا مدّعا تو وہی ہے خواہ کسی دَر سے آئے۔ اور اگر اُس کا جلوہ یقیناً بُت خانے میں ہے، تو پھر کافر ہو جانے میں کیا عیب ہے؟ آنکھوں کا مقصود تو وہی ہے خواہ کہیں بھی نظر آئے! ~

بدَیر و کعبہ، می گردیم، گاہ ایں جا و گاہ آں جا
کہ مطلب جستجوے اوُست، خواہ ایں جا و خواہ آں جا[1]

(نصیحتِ درویشانہ) چاہیئے کہ گوشہ نشین ہو جاؤ، اور کچھ دن خلقِ خدا سے کنارہ کش رہو، سب کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤ، کسی چیز کی طرف التفات نہ کرو، خدا پر نظر رکھو اور کسی سے ہرگز ملاقات نہ کرو، بوالہوس لوگوں سے بہت ملتے رہے اب وہ وقت ہے کہ پلک جھپکے اور موت آجائے! کب تک اونگھو گے؟ غفلت سے باز آؤ اور نکتہ رس ہو تو اس شعر کا مفہوم سمجھ لو۔

دیدہ ام، در علمِ صحبت ہاے رنگیں، صد کتاب
کردہ ام، یک مصرعۂ تنہا نشینی، انتخاب[2]

نہ جانے تم کیا سوچ رہے ہو جو (عشق کے) زخم کو ہرا نہیں کرتے، بس اب ہوا و ہوس کی سرگرانی چھوڑ دو اور یادِ الٰہی کے نشے میں سرشار ہو جاؤ اپنی سفید داڑھی کا خیال کرو کسی سے فریب اور چاپلوسی نہ کرو۔ کرامت کے اظہار کا کبھی ارادہ نہ کرنا، تم زبردست کے کھلیان میں گائے کی طرح ہو۔ خدائی میں دخل دینا اپنی بے عقلی کی شہرت کرنا ہے، اگر بے ارادہ کوئی کرامت ظاہر ہو بھی جائے تو گھمنڈ نہ کرنا، غرور کا نتیجہ پشیمانی ہے۔ درویش، غرور اور تکبر کو عیب سمجھتے ہیں اور گھمنڈی کو آدمیوں میں نہیں گنتے۔"

---

[1] (ترجمہ) ہم دیر و کعبے میں بھٹک رہے ہیں، کبھی یہاں ہیں کبھی وہاں کیوں کہ اُس (محبوبِ حقیقی) کی جستجو سے مطلب ہے خواہ وہ یہاں ملے یا وہاں!

[2] (ترجمہ) میں نے رنگین صحبتوں کے علم میں سینکڑوں کتابیں دیکھی ہیں اور اُن میں سے ایک مصرع انتخاب کیا ہے وہ ہے تنہا نشینی!

جب چچا رخصت ہوئے تو دل میں عہد کیا کہ آئندہ کہیں نہیں جاؤں گا، اور دن میں دو بار (پیر و مرشد کی خدمت میں) حاضری دوں گا۔

ایک دن میرے والد نے کہا: "اے برادرِ عزیز، دماغ ختم ہو رہا ہے، یعنی روز بروز ضعیف ہوتا جاتا ہے، اگر اِسے قرآن شریف کے حفظ کرنے میں لگایا جائے، تو کیسا ہے؟ چچا نے کہا "بہت اچھی بات آپ کے خیال میں آئی!"۔ چناں چہ ڈیڑھ سال کی مدت میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔

اسد اللہ کی آمد

(نقلِ عجیب) ایک دن دونوں بیٹھے (قرآن شریف کا) دورہ کر رہے تھے، کہ اسد اللہ نامی ایک درویش، نیلا لباس پہنے اور نمدی ٹوپی اوڑھے وارد ہوئے، جب والد کے سامنے آئے، انھوں نے فرمایا: "اے کبود جامہ کے تاجر، تم نے اتنا دُور دراز سفر کیوں اختیار کیا اور ایسے ویران راستے کے شدائد اپنے اوپر کیوں گوارا کیے؟" وہ عزیز سامنے آکر قدموں پر جھک گیا، (والد نے) اُن کا سر چھاتی سے لگایا اور اپنے پاس جگہ دی میرے چچا اس گرم جوشی پر حیران ہوئے، اور پوچھا، "یہ بزرگ کون ہیں؟" والد نے کہا: "میرے پرانے دوست ہیں!" چچا اور بھی حیرت زدہ ہوئے اور کہا "اتنی گہری دوستی کے لیے تو ملاقات کی کثرت ضروری ہے، مگر میں نے اِن بزرگ کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" والد نے فرمایا: "میں اور یہ ایک ہی پیر کے مرید ہیں، یہ دو سال میں ایک بار پیر کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، ایک دن میں نے پیر و مرشد کی خدمت میں سوال کیا، کیا ہو جو موت کے آثار پہلے سے مجھ پر ظاہر ہو جائیں، تاکہ میں آخرت کی تیاری میں مشغول ہو جاؤں اور دوسری باتوں میں دل نہ لگاؤں، ارشاد ہوا: "جب تم کبود جامہ کے اِس

تاجر کو دیکھو تو جان لینا کہ اگلے سال تک زندہ نہ رہو گے" لہٰذا یقین کر لو کہ اب میری عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔

چچا یہ الفاظ سُن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے: "اِن شاء اللہ میں یہ واقعہ نہ دیکھوں گا، یعنی اُس (منحوس) دن تک دنیا ہی میں نہ رہوں گا اور یہ صدمہ نہ اٹھاؤں گا!"۔ جب تازہ وارد درویش سے بات چیت شروع ہوئی تو اُس نے بیان کیا کہ "کچھ دنوں سے میری دکان نہیں چل رہی تھی، مال کا کوئی گاہک ہی نہ تھا، رات کو مال تیار کرتا تھا، صبح کو ڈال دیتا تھا، جو کچھ جمع پونجی تھی سب گھاٹے میں چلی گئی، ناچار مایوس ہو گیا۔ ایک دن اِسی رنج میں زمین پر لیٹا تھا کہ نیند کا جھونکا آیا اور سو گیا، دیکھا کہ پیر و مرشد میرے سرہانے کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اے اسد اللہ، ہر چند سفر میں بڑی دشواریاں ہیں اور راستہ بھی لمبا ہے، لیکن ایک بار علی متقی سے تمھارا ملاقات کرنا ضروری ہے، میرے اُن کے درمیان ایک اشارہ ہے، جیسے ہی تم پہنچو گے وہ سمجھ جائیں گے تمھیں چاہیے کہ فوراً روانہ ہو جاؤ اور کساد بازاری کا غم نہ کرو، جب وہاں سے واپس آؤ گے تمھارا مال ایسا ہاتھوں ہاتھ بکے گا کہ تبرک ہو جائے گا"۔ میں نے بیدار ہو کر دکان شاگرد کے سپرد کی اور زادِ راہ کے لیے آدھی سوکھی روٹی لے کر چل کھڑا ہوا، تھوڑی سی مدت میں ایک دنیا سے دوسری میں پہنچ گیا، یعنی 'کبود جامہ' سے آگرے آیا اور اپنے دلی اشتیاق کے مطابق تمھیں دیکھ لیا۔ اب میری واپسی، تمھارے اختیار میں ہے، جب اجازت دو گے واپس چلا جاؤں گا"۔ میرے والد مسکرائے اور کہا: "اے اسد اللہ! ایسے کیوں ہَوا کے گھوڑے پر سوار ہو؟ تمھارا مال خراب تو نہیں ہو گا جو اتنی بے تابی دِکھا رہے ہو،

تم ایسے کٹھن سفر سے آئے ہو اور اتنی زحمت گوارا کی ہے، اگر ہم فقیروں کے اتنے مشتاق نہیں ہو، تو اپنے آرام ہی کے لیے کچھ دن رہو، جلدی کیا ہے؟ واپسی بھی ہو جائے گی!" ایک ملازم کو حکم دیا کہ اُن کا بستر چچا کے حجرے میں بچھا دے اور خوب خدمت کرے۔ والد ایک لمحے کے لیے اُن سے جدا نہ ہوتے اور دل جوئی و مزاح گوئی میں اُنھیں لگائے رکھتے۔

(فایدہ) ایک دن اُس مہمانِ عزیز نے سوال کیا کہ "مجھے (خدا کی) رویت کے مسئلے میں کچھ تردد ہے، درویشوں کی دو جماعتیں ہیں، ایک کا خیال ہے کہ ایک دن ہم اُس غیرتِ ماہ (خدا) کو بدرِ کامل کی طرح (عیاں و برملا) دیکھیں گے اور دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ اُس آفتاب کا دیکھنا انسانی بصارت کے امکان میں نہیں!" والد نے فرمایا کہ "ہم فقیروں کو کچھ فکر نہیں، جب یہ طے شدہ ہے کہ وہ عینِ کائنات ہے، تو جدھر نظر ڈالتے ہیں وہ دکھائی دیتا ہے اور جس کسی میں دیکھتے ہیں، جلوہ دکھاتا ہے، وہ معنی (ہے اور) ہر صورت میں جلوہ گر ہے، نظر ہو تو اُس کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔"

القصہ، ایک ہفتے کے بعد وہ (اسد اللہ) رخصت ہوئے۔

چچا کی وفات (حکایتِ جاں سوز) عید کی صبح، میرے چچا، نئے کپڑے پہن کر نماز کے لیے گئے، جب واپس آئے، تو اُن کے سینے میں درد ہونے لگا اور ایسی شدت سے کہ چہرے کا رنگ اُڑ گیا، اور دل کا سکون جاتا رہا، میرے والد کو بلایا اور کہنے لگے: "میرے نہایت شدید درد ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ انجام بخیر نہیں، ایسی تکلیف ہے کہ دم گھٹا جا رہا ہے، غالباً اب جانِ ناتواں میں اتنی تاب نہیں

میری عبا بدن سے نوچ لو، کہ اِس سے وحشت ہوتی ہے، میری ٹوپی اُتار پھینکو یہ سر پر بوجھ بنی جا رہی ہے، جان میری ناتواں ہے اور یہ بیماری شدید۔ شام تک درد اور بھی بڑھ گیا اور اُس کی آہ آہ کا شور بلند ہوا، وہ سراپا دلِ دردمند بن گئے، ضبط کرتے تو غنچے کی طرح سمٹ جاتے اور درد سے آہ و فریاد کرتے تو پھول کی مانند پریشان نظر آتے، جب دل بہت گرفتہ ہوتا تو ایسی آتش ناک آہ بھرتے کہ جگرِ سوختہ کا دھواں آسمان پر پہنچتا، اگر بات کرتے تو یہ رباعی پڑھتے۔ (لمصنفہ)

وقت است کہ رو بہ مرگ یک بارہ کنیم
آں درد نداریم کہ ما چارہ کنیم
بیماریٔ صعبِ عشق دارد دلِ ما،
گر جامہ گزاریم، کفن پارہ کنیم لہ

جب گھڑی بھر رات گزری تو ناطاقتی حد سے بڑھ گئی، پیر و مرشد سے کہنے لگے کہ "آخر دل نے سختی اُٹھائی اور آنکھیں شدتِ غم سے پتھرا گئیں، آپ خود اس مَے خانے کے دانائے راز ہیں، اگر میری عمر کے پیمانے میں ابھی کچھ اور رہ گئی ہو، تو وہ کسی اور کو دے دیجیے کیوں کہ اِس شدید درد میں دُرد (تلچھٹ) پینے کے لیے بڑا کلیجا چاہیے! میں موت کی تلخی کو اس جانِ شیریں کے مقابلے میں سو درجے

لہ (ترجمہ) '(اب وہ) وقت ہے کہ بس یک لخت جان نکل جائے (کیوں کہ) ہم وہ درد نہیں رکھتے جس کا علاج ہو سکے ہمارے دل کو عشق کی جان لیوا بیماری ہے اور اس میں ہمارا جان سے گزر جانا ہی شفا یاب ہو جانا ہے۔ (ن۔ا۔ف)

گوارا تر سمجھتا ہوں، توجہ فرمایئے کہ اِس مشکل سے نجات پاؤں، رحم کیجیے تاکہ آرام مل جائے رات گئے اپنی کلاہِ شب پوش مجھے عنایت فرمائی اور غلبۂ ناتوانی سے آنکھیں بند کرلیں، جب رات آخر ہوئی یعنی سفیدۂ سحر نمودار ہوا تو اُن کی الم ناک روح لبوں پر آچکی تھی۔ اُدھر موذن نے "اللہ اکبر" کہا، اِدھر یہ شب زندہ دار بیمار سو گیا، یعنی دل پر ہاتھ رکھا اور جان، جاں آفریں کے سپرد کی۔

اُن کے پیرو مرشد (میرے والد) نے عمامہ زمین پر پھینک دیا، اور گریباں چاک کر لیا، اِس جاں کاہ صدمے سے چھاتی پیٹنے لگے، اُن کے مریدوں نے سر دل میں خاک اور جگر پر داغ لیے، اِسی رنجوری کے عالم میں میت کی رسوم ادا کیں، اور اُس دردمند (چچا) کا جنازہ تیار کیا ؎

عشق دردِ بے دوائے بودہ است

بہر جان و دل بلائے بودہ است [1]

جب لوگ نماز (جنازہ) کے لیے کھڑے ہوئے، تو بہت سے نڈھال ہو کر فرش پر گر گئے۔ میرے والد نے کہا: "اے ناواقفِ آدابِ آشنائی، دیر میں معلوم ہوا کہ تو بے وفا ہے، ایسا رخصت ہوا کہ میرا سینہ پھونک دیا، دوست ایسے تو نہیں جایا کرتے اور غم خوار اتنے بے مروّت تو نہیں ہوتے!" ؎

چہ شد آں وفا و عہدے کہ تو وعدہ ہا نمودی / بتو من چہ گفتہ بودم، تو بمن چہ گفتہ بودی [2]

---

[1] (ترجمہ) عشق ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں، یہ (ہمیشہ) جان و دل کے لیے ایک مصیبت رہا ہے۔

[2] (ترجمہ) وہ وفا، اور عہد کیا ہوا؟ جب تو نے مجھ سے کچھ وعدے کیے تھے، میں نے تجھ سے کیا کہا تھا اور تو نے مجھ سے کیا کہا تھا؟۔

بزرگوں نے جنازے کو کندھا دیا، یعنی پوری عزت سے اُٹھایا، پیر و مرشد (والد) کی آہیں مُردے کے علم کی طرح جنازے کے آگے آگے چل رہی تھیں، اُن (چچا) کے معتقد آٹھ آٹھ آنسو روتے ہوئے میت کو شہر سے باہر لے گئے، وہاں ایک باغ کے گوشے میں سپردِ خاک کر کے، پھول برسائے اور فاتحہ پڑھی۔ نہایت صدمہ اُٹھایا اور سوائے صبر کے کوئی علاج نہ پایا!

تیجے کے دن جب شہر کے لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آئے تو میرے والد نے کہا کہ "جس کا ایسا عزیز مر گیا ہو، اگر اُسے "عزیز مردہ" کہیں تو بجا ہے، آج سے مجھے "عزیز مردہ" کہا جائے"۔ چناں چہ وہ شہر میں اِسی لقب سے مشہور ہو گئے، دن میں سو سو بار روتے تھے اور مُردوں کے حال میں جیتے تھے، میں جو مرحوم چچا کا گود دوں پالا تھا اور اپنی ساری ضرورتوں کو اُن سے کہتا تھا، انھیں کے ساتھ سوتا اور کھاتا تھا۔ اب دن بھر انھیں یاد کرتا اور رات بھر آنسو بہاتا، درویش عزیز مردہ (والد) ہر طرح میری دل جوئی کرتے، اور کبھی مجھے آزردہ نہ ہونے دیتے، کبھی کہتے کہ "بیٹے، میں تمھیں بہت چاہتا ہوں، مگر اِس غم سے گھلا جاتا ہوں کہ میں بھی برسرِ راہ ہوں۔" کبھی فرماتے: "میرے چاند! اب تم گود کے بچّے تو نہیں ہو، خدا کا شکر ہے، دس سال کے ہو گئے، کیوں جی کڑھاتے ہو، آخر درویش زادے ہو، دل مضبوط رکھو، اپنے تئیں خدا کو سونپ دو، ہشاش بشاش رہو، اور مجھے اپنا ناز بردار سمجھو۔ میری جان، کیا تم دودھ پیتے بچے ہو جو ہر وقت روتے ہو، اپنا غم کیوں کرتے ہو۔ تمھارا وارث تو خدا ہے! جانے والے کبھی نہیں آتے، گزرنے والے منھ نہیں دکھاتے، بیٹے یہاں چل چلاؤ لگ رہا ہے جسے بھی دیکھتے ہو وہ آمادۂ سفر ہے۔

یہ مت سمجھو کہ دنیا تمھارے رہنے کی جگہ ہے۔

یہ تو دم کی مجلس ہے گمان کر رکھا ہے، جو حاضر تھے چلے گئے، جو بیٹھے تھے گزر گئے، کلی کی طرح دلگیر نہ بنو، پھول کی مانند مسکراؤ، اِس چمن کی بہار تو اُجڑنے والی ہے، بے وجہ اپنا دل میلا نہ کرو، دنیا کے اس قمار خانے میں تم ایسے بہت سے دل ہار چکے ہیں، تم جب تک یہاں کی راہ و رسم سے واقف نہ ہو جاؤ، ہرگز اِس راستے پر نہ چلنا' پاکھنٹ کھلاڑیوں میں ایک کہاوت ہے "قمار در راہ قمار" یعنی جب تک کسی کام سے اچھی طرح آگاہ نہ ہو جاؤ اُس پر ہاتھ نہ ڈالو!" وہ ہر روز ایسی ہی باتیں کرتے اور بڑے لاڈ پیار سے میری پرورش کرتے تھے۔

احمد بیگ (نقل) ایک دن، رنج کے عالم میں (چچا کی) موت کا حلوا تقسیم کر رہے تھے، کہ ایک شکری رنگ، خوش وضع، نوجوان، جس کا نام احمد بیگ تھا، آیا، اور ولایتی انگور کے کچھ دانے ہاتھ میں رکھ کر نذر گزرانے اور کہا کہ ابھی ولایت سے آرہا ہوں اور حج کے لیے جانے کا ارادہ ہے، اِس شہر میں آیا تو آپ کی درویشی کا آوازہ سنا، مشتاقِ دیدار ہو کر خدمتِ سامی میں حاضر ہوا ہوں۔" والد نے فرمایا: "تم نے شاید یہ نہیں سنا ؎

چرا بر پائے خود اے کعبہ رو نمی اُفتی
ہماں توئی کہ بقر سنگ می نمایندت [1]

---

[1] (ترجمہ) اے کعبے کی طرف جانے والے، تو اپنے ہی قدموں پر کیوں نہیں جھکتا، وہ خود تو ہی ہے۔ جسے فاصلے سے دکھایا جا رہا ہے، (کعبہ تو خود تیری ذات ہے، اپنے نفس کا عرفان حاصل کر۔)

پہلے خود کو پاؤ، پھر کعبے جاؤ، کعبہ فقیروں کے دل ہائے خستہ کا نام ہے اور مقصود ان جگر ریشوں کی قربت ہے، اگر فقیروں کے دل کو متوجہ کر لو تو وہ بغیر سعی و کوشش کے کعبۂ مراد دکھا دیتے ہیں، اسی لیے تو کوئی کہہ گیا ہے ؎

ز کعبہ آیم و در رشک آیدم بہ خوں نابے

کہ از زیارتِ دل ہائے خستہ می آید لہ

تم جو کچھ کہتے ہو، حرم کے محرم بھی وہی کہتے ہیں، جسے تم ڈھونڈھتے ہو، کعبہ خود بھی اُسی کو ڈھونڈ رہا ہے ؎

ہر کرا دیدم چو من گم گشتۂ تحقیق بود

کعبہ را ہم بے تکلف در بیاباں یافتم لہ

دلوں کا طواف کرو، یہی کعبے کا طواف ہے، اپنے ہی جویا بنو، اچھا مقصد یہی ہے، غیر (یعنی غیر اللہ) کا کوئی وجود نہیں، اور کوئی شے (ذات احدیت کے بغیر) مشہود و موجود نہیں ؎

گفتم بہ حرم، محرم ایں خانہ کدام است؟

آہستہ بمن گفت، کہ بیگانہ کدام است؟ لہ

لہ (ترجمہ) میں کعبے سے آ رہا ہوں، مگر مجھے اُس خوں ناب پر رشک آتا ہے جو زخمی دلوں کی زیارت کر کے آتا ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ کعبے کی زیارت سے بہتر دل کی زیارت ہے!)۔

لہ (ترجمہ) میں نے جسے بھی دیکھا، میری ہی طرح تحقیق میں سرگرداں تھا۔ کعبے کو بھی بیاباں میں سرگرم جستجو پایا۔

لہ (ترجمہ) میں نے حرم سے سوال کہ اس گھر کا محرم کون ہے، اُس نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ یہاں بیگانہ بھی کون ہے؟ (حکیم شرف الدین شفائی)

مجھے تمھاری جوانی پر رحم آتا ہے کہ رنج اٹھاؤ گے مگر مقصود پھر بھی نہ پاؤ گے، درویشوں کی بات پوری توجّہ سے سنو، کچھ دن ٹھیرو اور یہاں سے نہ جاؤ، اُس جوان نے جب درویش کو ملتفت پایا تو حکم سے سرتابی نہ کی یعنی ٹھیر گیا اور سخت ریاضت میں مشغول ہوا، ذہنِ سلیم رکھتا تھا، اکتساب کیا اور سات مہینے میں مرتبۂ کمال تک پہنچ گیا۔ ایسی خوبی کا پیر اور ایسا محبوب جوان، ایسی حالت کا پیر اور اِس کیفیت کا جوان، ایسا باکمال پیر اور ایسا صاحبِ حال جوان، ایسا عنایت رکھنے والا پیر اور اتنی ارادت رکھنے والا جوان، ایسی نظر کرنے والا پیر اور ایسا اثر قبول کرنے والا جوان، زمانے کی آنکھوں نے کم دیکھا اور اہلِ دنیا کے کانوں نے کم سُنا ہے! وہ رات دن شیر و شکر کی طرح ایک جگہ رہتے تھے، اور بڑی یک جہتی تھی، وہ جوان، اپنے پیر کو ایک لمحے کے لیے بھی نہ چھوڑتا تھا۔ اور "جوانِ عزیز" کے لقب سے مشہور تھا۔ اتفاقاً پیر و مرشد کے پاس کہیں سے کچھ روپیہ آیا، اُنھوں نے جوان سے فرمایا کہ "اسے خرچ کرو اور حجاز کے سفر پر جاؤ۔" صبح کی نماز کے بعد اُسے زیرِ پیچ دستار اور سجادۂ محرابی عنایت کیا، اور رخصت کر دیا۔

والد کی وفات

(حکایتِ جاں کاہ) ایک دن دھوپ چڑھے، "درویش عزیز مردہ" (والد) برادرِ عزیز (میر امان اللہ) کے بھانجے محمد باعث کی عیادت کے لیے، جو ایک عالم، فاضل، اور متصوف کامل تھے، محلہ عالم گنج گئے جو آگرے کا مشہور محلّہ ہے! شام ہونے لگی تو وہاں سے گھر کی جانب واپس ہوئے، مغرب اور عشا کی نماز اپنی مسجد میں ادا کی؛

جب سونے کے لیے بستر پر گئے اور میں حاضر ہوا تو فرمایا: "بیٹے! آج آفتاب[1] کی حرارت میرے مزاج پر اثر انداز ہوئی ہے، سر میں درد ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بخار چڑھے گا" رات کا کھانا نہیں کھایا اور سو گئے، صبح کو بیدار ہوئے، تو بہت تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ حکیم ابوالفتح جو اُن کے پرانے معالج تھے آئے اور ٹھنڈائی پلائی، مگر کچھ افاقہ نہ ہوا، درویش کو بخار ٹھیر گیا، یعنی روز شام میں چڑھتا اور ساری رات رہتا، بخار توڑنے کی ان گنت ترکیبیں کر دیکھیں، لیکن کسی سے یہ عقدہ حل نہ ہوا، ایک مہینے کے بعد تشخیص ہوا کہ بخار نے قلب کو لپیٹ لیا ہے اور ہڈیوں میں بیٹھ گیا ہے، یعنی یہ درویشِ نحیف، جو مٹھی بھر ہڈیوں سے زیادہ نہیں، دق میں مبتلا ہے۔

---

[1] مخدومی قاضی عبدالودود صاحب نے صحیح اعتراض فرمایا ہے کہ میر کے والد کا انتقال رجب ۱۱۴۶ھ میں ہوا اور یہ مہینہ دسمبر (۱۷۳۳ء) کے مطابق پڑتا ہے، اس زمانے میں لو لگ جانا کس طرح ممکن ہے؟ (معاصر حصہ ۹)۔ میر نے یہ الفاظ لکھے ہیں "..... در آفتاب گرم رفت' ..... گفت' ای پسر حرارتِ آفتاب در مزاجِ من تاثیرے کردہ است" (ذکرِ میر ص ۵۷) اِس کے بعد کی عبارت اور اُن کے علاج کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ علی متقی رجب سے ایک دو ماہ پہلے بیمار ہوئے تھے' "پس از ماہے مشخص گردید کہ ایں تپ متشبث بقلب است" (ذکر میر ۵۸) ظاہر ہے کہ مہینہ بھر تو صحیح تشخیص بھی نہ ہو سکی تھی، اگر میر امان اللہ کا انتقال شوال ۱۱۴۵ھ مطابق مارچ ۱۷۳۳ء میں ہوا، اور امان اللہ کے انتقال کے بعد احمد بیگ کا آنا' اور سات ماہ تک رہ کر ریاضت کرنا بھی میر کی تحریر سے ظاہر ہے (ص ۵۵ ذکرِ میر) اور شوال (۱۱۴۵ھ) سے ربیع الثانی (۱۱۴۶ھ) تک یہ ۷ ماہ پورے ہوتے ہیں' تو علی متقی جمادی الاول (۱۱۴۶ھ) میں بیمار پڑے ہوں گے، لیکن یہ بھی مطابق ہے (ستمبر ۱۷۳۳ء) کے۔ میں نے یہاں صرف لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔
(ن-ا-ف)

(ایک دن) مجھ سے کہنے لگے: "بیٹے، میری جان ہر طرف نیاز ہی اور جسم گھُلا جاتا ہی۔ غذا سے مطلق رغبت نہیں، کھاتا ہوں تو گرانی کرتی ہی۔ طبیب جو دوا صبح دیتا ہی وہ (معدے میں) اگلی صبح تک ویسے ہی دھری رہتی ہی۔ چاہتا ہوں کہ اب موت آنے تک غذا چھوڑ دوں۔ بازار سے نرگس کے چار پانچ دستے لے آؤ تاکہ بشرطِ زندگی اُنھیں کبھی کبھی سونگھ لیا کروں۔" میں ارشاد کے بموجب لایا اور اُن کے سامنے رکھ دیئے، جب آنکھ کھولتے، دستہ ہاتھ میں لے کر سونگھتے اور فرماتے: "خدا کا شکر ہی، سیر ہو گیا!" جب اُنھوں نے غذا ترک کر دی تو ہم بے کسوں کو اپنی زندگی سے بالکل ہی مایوس کر دیا۔ ہاتھ پاؤں کی طاقت جواب دے گئی، ضعف حد سے بڑھ گیا، بات بہت کم کرتے اور نماز بھی اِشاروں سے پڑھتے تھے۔ ۲۱ رجب[1] کو حسبِ معمول، حکیم ٹھنڈائی کا پیالہ لایا تو درویش نے ناک بھوں چڑھائی، اور دوا پینے سے انکار کر دیا، پیالہ زمین پر پٹک کر بولے: "اے کم بخت! دوا کا تاثیر کرنا تو مجھے اوّل دن سے معلوم تھا، مگر تیرا لحاظ کر کے پی لیتا تھا، افسوس تو نے اتنی سی بات نہ سمجھی، جا، اب مجھے (میرے حال پر) چھوڑ دے، نا قباحت فہمی وہ مرض ہی جس کوئی علاج نہیں!"

اُس وقت حافظ محمد حسن کو بلایا جو میرے بڑے اور علاتی بھائی[2] تھے، اور

---

[1] ۱۱۴۶ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۷۳۳ء

[2] حافظ محمد حسن کی والدہ خانِ آرزو (سراج الدین علی خان)، کی بہن تھیں، اُن کے انتقال کے بعد میر محمد علی (علی متقی) نے میرؔ کی والدہ سے نکاح کر لیا تھا۔ میرؔ نے صرف ایک جگہ (ذکرِ میرؔ ص ۲۰) اپنی ماں کا تذکرہ کیا ہی "... مادر و پدرم نگذاشت" اس کے بعد کہیں اشارہ تک نہیں، میرا خیال ہی کہ علی متقی کی زندگی ہی میں میرؔ کی والدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ (ن ۔ ا ۔ ف)

فرمایا کہ "میں فقیر ہوں، میرے پاس کچھ اثاثہ نہیں، بس تین سو کتابیں ہیں، وہ میرے سامنے لاؤ اور بھائیوں میں تقسیم کر لو۔" وہ کہنے لگے: "میں طالبِ علم ہوں اور میرا کتابوں سے بیشتر واسطہ رہتا ہے، یہ چھوٹے بھائی کتابوں سے کوئی ربط ہی نہیں رکھتے اُن کے ورق پھاڑ ڈالیں گے، ایک پتنگ بنائے گا، دوسرا ناؤ بنا کر پانی میں بہا دے گا۔ اگر آپ یہ سب کتابیں مجھی کو سونپ دیں تو اچھا ہے ورنہ آپ مختار ہیں۔" والد کو اُن کی بدنیتی کا اندازہ تھا اُنھیں ڈانٹا اور کہنے لگے: "اِس سے کیا ہوتا ہے جو تو نے فقیروں کا بھیس بدل لیا ہے، تیری مکاری اور حیلہ سازی تو ابھی تک گئی نہیں، تو چاہتا ہے کہ اِن بچوں سے دغا کرے، اور میری آنکھیں بند ہونے کے بعد اِنھیں نقصان پہنچائے! یاد رکھ کہ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور غیور کو پسند کرتا ہے، غالب ہے کہ میر محمد تقی تیرا دستِ نگر نہ ہوگا، اگر تو اُس کے ساتھ دوسری طرح پیش آئے گا تو نیچا جھانکے گا اور تیری عزت کا نقش اُس کے سامنے نہیں بیٹھے گا۔ اگر تو اپنی منشا میں کامیاب ہو گیا، تو یہ ایک جلد کتاب کے بدلے تیری کھال کھینچ لے گا۔ کم ظرف انسان قابلِ اعتبار نہیں رہتا اور بخل و حسد، ذلّت و خواری کی علامت ہے، بہتر ہے، یہ کتابیں تو ہی لے جا اور رکھ لے!" اِس کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "بیٹے! میں بازار کے بنیوں کا تین سو روپے کا مقروض ہوں، اُمید ہے جب تک قرض ادا نہ کر دو گے میرا جنازہ نہ اُٹھاؤ گے۔ کیوں کہ میں معاملے کا صاف رہا ہوں اور تمام عمر کسی کو دھوکا نہیں دیا۔" میں نے عرض کیا کہ سوائے اِن کتابوں کے اور کوئی اثاثہ نظر نہیں آتا، وہ کتابیں بھی آپ نے بڑے بھائی کو سونپ دیں، اب میں قرض کہاں سے ادا کروں گا؟" والد کی آنکھیں

ڈبڈبا گئیں اور فرمانے لگے: "مایوس نہ ہونا چاہیئے، خدا کریم ہے، ہنڈی راستے ہی میں ہے اور پہنچا چاہتی ہے، چاہتا تھا کہ روپیہ آنے تک زندہ رہوں، لیکن عمر کے چند ہی لمحے باقی رہ گئے ہیں۔ اب ٹھیرنا ممکن نہیں۔" پھر مجھے دعا دی، اور خدا کے سپرد کیا، کچھ سانسیں اور آئیں، اس کے بعد انتقال فرمایا۔

بھائی کی طوطا چشمی

درویش نے آنکھیں مونديں تو سارا عالم میری نظروں میں تاریک ہو گیا۔ بڑا حادثہ رونما ہوا، آسمان مجھ پر ٹوٹ پڑا، آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا، صبر و شکیب جاتا رہا، دیواروں سے سر پھوڑتا تھا، خاک پر لوٹتا تھا، بڑا ہنگامہ بپا ہوا گویا قیامت نمودار ہو گئی۔ میرے بڑے بھائی نے انسانیت بالائے طاق رکھ کر طوطا چشمی اختیار کر لی۔ جب دیکھا کہ باپ مفلس مرا ہے اور قرض خواہ میرے دامن گیر ہوں گے، تو پہلو بچا گئے اور کہنے لگے:
"جو لاڈ پیار کے پالے پوسے ہیں، وہ جانیں اور اُن کا کام! میں تو باپ کی زندگی میں بھی دخیل کار نہ ہوا اور ترکے سے بھی درگزرا، اُن کے سجادہ نشین سلامت رہیں جو سر پیٹ رہے ہیں اور منھ نوچ رہے ہیں، وہ جو مناسب سمجھیں گے کریں گے!"

میں نے بیکسی کا یہ تازہ صدمہ اُٹھایا تھا، جب اُن کی یہ چھچھوری اور کمینی باتیں سُنیں تو غم و غصہ اور بھی زیادہ ہوا، مگر اُن سے کوئی التجا نہ کی، ہمت کو مضبوط رکھا اور خدا پر بھروسا کر کے بیٹھ گیا، بازار کے بنیے مزید دو سو روپے لائے اور بے حد خوشامد کی، مگر میں نے درویش کی وصیت کا پاس کیا اور وہ روپے قبول نہ کیے۔ صاف انکار بھی نہ کیا کہ شاید ملول ہوں۔ باتوں میں گھماتا رہا۔

اتنے میں سیّد مکمل خاں جو میرے عمِ بزرگوار کے مرید تھے، اُن کا نوکر پانچ سو

رُپے کی ہنڈی لے کر آیا اور میرا شریکِ غم ہوا، میں نے تین سو رُپے تو قرض خواہوں کو ادا کر کے فارغ خطی حاصل کر لی اور سنو رُپے سے فقیر کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور پیر و مرشد کے پہلو میں اُنھیں مدفون کیا۔

میری سرگزشت

(والد کی موت کے بعد میں نے) فلک کی بے مروّتی دیکھی، زمانے کے ستم جھیلے، نہیں نہیں، فلک یا زمانے کا کیا قصور؟ میرا ہی ستارہ منحوس تھا کہ ایسے آفتاب کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا، جو کچھ بھی کیا میری قسمت نے کیا، سوائے میرے اپنے ہاتھ کے اور کسی کا ہاتھ میرے سر پر نہ تھا، یعنی کوئی سرپرست نہ تھا۔ مگر میں نے غیرت کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اور ہرگز کسی کے دروازے پر سائل بن کر نہ گیا اور نہ میرے ہونٹ حرفِ طلب سے آشنا ہوئے، نہ مجھے کسی چیز کی طمع پیدا ہوئی۔ کسی سے میں نے امداد طلب نہیں کی، نہ کسی نے مجھے امداد دی! یعنی خدائے کریم نے مجھے کسی کا شرمندۂ احسان نہ کیا، اور مجھے میرے بھائی کا جو مجھ سے کینہ رکھتے تھے دست نگر نہ بنایا۔ میں رات دن گردشِ کا ماتم کرتا تھا۔

اور تمام کام خدا کے آسرے پر چھوڑ دیے تھے۔ چھوٹے بھائی کو گھر بٹھا کر روزگار تلاش کرنے کے لیے سارے شہر میں گھومتا تھا، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، یعنی وطن میں کوئی صورت نہ نکلی تو پردیس کا رُخ کیا، راستے کی صعوبتیں اپنے اوپر گوارا کیں اور سفر کے شدائد جھیل کر شاہ جہاں آباد دہلی پہنچا، یہاں بھی بہت گھوما مگر کسی کو شفیق نہ پایا!

دہلی میں

خواجہ محمد باسط نے جو امیر الامرا صمصام الدولہ[1] کے بھتیجے تھے، میرے حال پر عنایت کی اور مجھے نواب کے سامنے لے گئے۔ (نواب نے)

---

[1] امیر الامرا کا نام خواجہ عاصم تھا، اُن کے بزرگ بدخشاں سے ہجرت کر کے اکبر آباد میں آ بسے تھے۔ جن میں بعض نے سپاہ گری کا پیشہ اختیار کیا اور کچھ فقر و درویشی کی طرف مائل ہوئے۔ خواجہ عاصم کے بڑے بھائی خواجہ محمد جعفر باخدا صوفی تھے، خواجہ محمد باسط جن کا انتقال ۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء میں لکھنؤ میں ہوا، انھیں خواجہ جعفر کے فرزند اور مشائخ نقشبندیہ میں نام برآوردہ بزرگ تھے۔

خواجہ عاصم پہلے پہل قلیل منصب پر دربارِ شاہی سے منسلک ہوئے تھے، لیکن فرخ سیر کے زمانے میں ترقی کر کے دیوانِ خاص کے داروغہ ہوئے اور اشرف خاں خطاب پایا، پھر میر آتش بنائے گئے اور نقارہ و نشان کے ساتھ ہفت ہزاری منصب، ہفت ہزار سوار اور صمصام الدولہ خان دوراں بہادر منصور جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ امیر الامرا حسین علی خاں دکھن چلا گیا تو یہ میر بخشی بنائے گئے، پھر بخشی دوم ہوئے اور گجرات کی صوبہ داری اُن کے سپرد کی گئی، صوبہ مذکور کا انتظام ان کی نیابت میں حیدر قلی خاں کرتے تھے۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد انھیں امیر الامرا کا خطاب اور میر بخشی گری کا عہدہ ملا۔ خواجہ محمد عاصم بڑے علم دوست، صوفی منش، متواضع اور سنجیدہ رئیس تھے، اکثر اہلِ علم اُن کے دربار سے وابستہ تھے۔ اُن کے زمانے میں قلعہ دہلی ناپاک سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن وہ اِن ریشہ دوانیوں میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء

مجھے دیکھ کر پوچھا: "یہ کس کا لڑکا ہے؟" (خواجہ محمد باسط نے) کہا: "میر محمد علی کا!" فرمانے لگے کہ "اس کے یہاں آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے گزر چکے ہوں گے۔" پھر بہت افسوس ظاہر کرنے کے بعد کہنے لگے کہ "اُن (علی متقی) مجھ پر بڑے حقوق ہیں، ایک روپیہ روز میری سرکار سے اس لڑکے کو دیا جائے۔" میں نے التماس کیا کہ "اگر اتنی مہربانی کریں کہ مجھے دستخط فرماکر دے دیں تو متصدیوں کے چون وچرا کرنے کی گنجائش نہ رہے گی" یہ درخواست جو میں نے لکھ کر جیب سے نکالی، اچانک خواجہ مذکور کی زبان سے نِکلا کہ "یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے۔" یہ سُن کر میں نے ٹھٹھا مارا، نواب نے میرے منھ کو دیکھا اور ہنسی کا سبب پوچھا، میں نے عرض کیا کہ "آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، اگر یہ فرماتے کہ قلم دان بردار حاضر نہیں، تو ایک بات بھی تھی، یا یہ کہنا بھی ٹھیک تھا کہ یہ نواب کے دستخط کرنے کا وقت

میں جب نادر شاہ نے چڑھائی کی تو محمد شاہ جنگ کرنے کے لیے کرنال تک گیا، تعاقب میں امیرالامرا افواج لے کر بطور کمک گئے، اور ۱۳ر فروری (۱۷۳۹ء) کے ہنگامے میں بُری طرح ہوئے۔ اِنھیں زخموں نے ۱۷ر فروری کو ۶۸ سال کی عمر میں اُن کی جان لی۔ نادر شاہی حملے میں اُن کے بھائی مظفر خاں (جو اجمیر کے صوبہ دار رہ چکے تھے) اور تین بیٹے بھی کام آئے، ایک بیٹے عاشوری خاں نادری فوج کے ہاتھوں قید کر لیے گئے۔ رہائی کے بعد انھیں محمد شاہ نے باپ کا خطاب دیا اور ۱۱۶۷ھ میں میر آتش کا عہدہ دیا۔ عاشوری خاں عالم گیر ثانی کے عہد میں امیرالامرا ہوئے۔ اور کچھ دنوں بعد انتقال کیا۔

(مآثر الامرا ۱/ص ۸۱۹ تا ۸۲۳)

نہیں ـــ "قلمدان کا وقت نہیں" کہنا تو نئی ترکیب ہے، قلم دان کا وجود ایک لکڑی سے زیادہ نہیں، وہ وقت وغیر وقت نہیں جانتا، جس شخص کو بھی حکم دیا جائے اُٹھالائے گا"۔ نواب ہنسنے لگے اور بولے "معقول بات کہتا ہے"۔ غرض میری درخواست کو ردّ نہ کیا، قلمدان منگوایا۔ اور درخواست پر دستخط کر دیئے۔ وہ بادشاہ کے دربار کا دن تھا، (نواب) تیار ہو کر چلنے لگے، اور بڑی عنایت سے مجھے رخصت کیا۔

اُس زمانے تک کہ، نادر شاہ[1] نے محمد شاہ پر، جواب فردوس آرامگاہ کے لقب سے مشہور ہیں، چڑھائی کی اور نواب مذکور اُس کے مقابلے میں مارے گئے، یہ روزینہ مجھے ملتا رہا، اِسی سے نان و نمک کھا کر گزارہ کر رہا تھا۔

پھر دہلی میں

اس انقلاب (حملہ نادری) کے بعد، پھر سنگ دل زمانے نے مجھے ستایا، وہ لوگ جو درویش کی زندگی میں میری خاکِ پا بھی سُرمے کی طرح آنکھوں سے لگاتے تھے، اب مجھ سے آنکھیں

---

[1] نادر شاہ درّانی، ۹ مارچ ۱۷۳۹ء کو فتح و ظفرمندی کا نقارہ بجاتا ہوا، دہلی میں داخل ہوا، ۱۱، ۱۲، ۱۳ مارچ (۱۷۳۹ء) کو دہلی میں قتل عام کیا جس میں تیس ہزار سے زائد انسان قتل ہوئے، ۵ مئی کو ۵۸ دن قیام کرنے کے بعد اس حالت میں رخصت ہوا کہ آٹھ مغل تاجداروں کے جمع کیے ہوئے خزانے اُس کی مٹھی میں تھے اندازے کے مطابق ۷۰، ۸۰ کروڑ کے درمیان کی مالیت کا سونا، چاندی، ہیرے اور زرِ نقد وہ اپنے ساتھ لے گیا جو دس ہزار اونٹوں، دس ہزار گھوڑوں اور تین ہزار جنگی ہاتھیوں پر لادا گیا تھا۔ (فریزر: نادر شاہ)

گھبرانے لگے۔ مجبور ہو کر دوسری بار دہلی پہنچے[1] اور بڑے بھائی کے ماموں، سراج الدین علی خاں[2] آرزو کا احسان اُٹھایا، یعنی کچھ دن اُن کے ساتھ رہا اور شہر کے

---

[1] مخدومی قاضی عبدالودود صاحب فرماتے ہیں: "میر نے وفات محمد علی کے بعد دہلی آنے اور یہاں روزینہ مقرر ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ دہلی سے آگرہ کب واپس گئے وہاں سے دوسری بار دہلی آنے کا حال البتہ تحریر کیا ہے، میر نے حملۂ نادری اور قتل عام کی کیفیت مطلقاً نہیں بیان کی، اگر اِن امور کے شاہدِ عینی ہوتے تو معاملہ برعکس ہوتا۔ صمصام الدولہ کا وطن آگرہ تھا اور اُن کے لیے اس میں ذرا بھی دشواری نہ تھی کہ روزینہ آگرے ہی میں ملنے کا انتظام کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ روزینہ مقرر ہونے کے بعد آگرے واپس گئے اور پھر نادر گردی ختم ہو گئی تو دہلی آئے۔" (معاصر حصہ ۹)

[2] سراج الدین علی خاں آرزو حسام الدین حسام کے بیٹے تھے، ان کا سلسلۂ نسب شیخ کمال الدین خواہرزادۂ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی تک پہنچتا ہے۔ اور ننھیال کا سلسلہ مشہور بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری پر منتہی ہوتا ہے۔ آرزو کی پیدائش ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء میں ہوئی۔ وہ بچپن میں کچھ زمانے تک گوالیار رہے۔ اور ۱۱۳۲ھ میں آگرے سے دہلی آئے۔ یہاں انند رام مخلص کی وساطت سے دربارِ شاہی میں پہنچے اور منصب و جاگیر سے سرفراز ہوئے۔ مؤتمن الدولہ اسحاق خاں شوستری نے اُن کے ساتھ بڑا سلوک کیا، اسحاق خاں کے مرنے پر اُن کے بیٹے نجم الدولہ نے بھی ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ جاری رکھا نجم الدولہ کے انتقال کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی سالار جنگ انھیں پورب کی طرف لے گئے۔ وہاں شجاع الدولہ کی سرکار سے تین سو روپیہ ماہانہ مقرر کرا دیے۔ وہیں ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء کو آرزو کا انتقال ہو گیا، اُن کی نعش دہلی لا کر دفن کی گئی۔ آزاد بلگرامی نے تاریخ کہی:

"رحمتِ کامل بر روحِ آرزو"

آرزو اپنے عہد کے مستند عالم اور محقق تھے، وہ فارسی، عربی کے علاوہ ہندی، سنسکرت اور دوسری ہندستانی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ اُردو میں بہت کم شعر کہتے تھے، لیکن اُن کی تربیت سے اُردو کے بہت سے نامی گرامی شعرا فیض یاب ہوئے، جن میں میر کے علاوہ درد، سودا، مضمون، مخلص، یک رنگ وغیرہ کا نام بھی آتا ہے۔ تصانیف کی تعداد ۱۵ بتائی جاتی ہے، جن میں

لوگوں سے چند کتابیں پڑھیں۔ جب اِس قابل ہو گیا کہ کسی کا مخاطب صحیح بن سکوں تو بھائی کا خط (ماموں کے نام) پہنچا کہ "میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے، اس کی تربیت ہرگز نہ کرنی چاہیئے بلکہ دوستی کے پردے میں کام تمام کر دینا چاہیئے۔" وہ عزیز (آرزو) پکے دنیادار تھے، اپنے بھانجے کی عداوت دیکھ کر میرا برا چاہنے لگے، اگر میں سامنے پڑتا تو بھٹکارنے لگتے، اور بچ بچ کر رہتا تو اول فول بکتے، ہر وقت اُن کی نگاہیں میری نگرانی میں رہتیں اور دشمنوں کا سا برتاؤ کرتے، میں کیا بیان کروں کہ اُن سے کیسا سلوک دیکھا اور کس طرح کہوں کیا رنج اٹھائے ہیں ہر چند صبر و ضبط کرتا، اور لاکھ احتیاج ہو مگر اُن سے ایک رُپیہ بھی نہ مانگتا تھا مگر وہ دشمنی سے باز نہ آتے تھے اگر اُن کی ایذا دہی کا ماجرا تفصیل سے بیان کروں تو ایک علیحدہ دفتر درکار ہے، میرا دُکھا ہوا دل اور بھی زخمی ہو گیا۔

جنون اور میں پاگل ہو گیا، مزاج میں وحشت پیدا ہو گئی، جس کوٹھری میں رہتا تھا اُس کا دروازہ بند کر لیتا اور اِس ہجوم افکار میں تنہا بیٹھ جاتا، چاند نکلتا تو میرے لیے قیامت ہوتی تھی، اگرچہ میں اُس وقت سے چاند کو دیکھتا آیا تھا جب منہ دُھلاتے وقت دایہ "چاند چاند" کہتی اور میں آسمان

چند یہ ہیں: نوادر الالفاظ، جو اردو کا سب سے پہلا لغت ہے، چراغ ہدایت، سراج اللغات، موہبت عظمیٰ، عطیۂ کبریٰ، داد سخن، مثمر، مجمع النفائس، تنبیہ الغافلین، خیابان (شرح گلستان سعدی) اور دو[۲] دیوان فارسی۔

(خزانۂ عامرہ ص ۱۱۶ تا ۱۱۹ - قاموس المشاہیر ۱/۲۸۵ - اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۴۳ء جلد ۲۰، عدد ۱، ص ۳ تا ۲۵)۔

کی سمت دیکھتا تھا، لیکن نہ اِس طرح کہ دیوانگی تک نوبت پہنچ جائے اور وحشت اتنی بڑھ جائے کہ لوگ مجھ سے ڈر کر میری کوٹھری کا دروازہ بند کر دیں اور مجھ سے دور بھاگنے لگیں!

(نقلِ عجیب) چاندنی رات میں ایک حسین پیکر، اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ کرۂ قمر سے میری طرف آتا اور مجھے بے خود کر دیتا تھا، جدھر بھی آنکھ اُٹھتی اُسی رشکِ پری پر پڑتی، جس طرف دیکھتا، اُسی غیرتِ حور کا تماشا کرتا، میرے گھر کے در و بام اور صحن گویا ورقِ تصویر ہو گئے تھے۔ یعنی ہر سمت وہی حیرت افزا (چہرہ) نظر آتا، کبھی چودھویں کے چاند کی طرح سامنے، کبھی سیر گاہِ دل میں محوِ خرام! اگر گلِ مہتاب پر نظر پڑ جاتی تو جان اور بھی بے قرار ہو جاتی۔ ہر رات اُس پری پیکر سے ملاقات ہوتی اور ہر صبح اُس کی جدائی میں وحشت، جب سفیدۂ سحر نمودار ہوتا، دل سے ٹھنڈی آہیں نکلنے لگتیں! یعنی دل مچلتا اور چاند کی طرف لپکتا، تمام دن یہی جنون سوار رہتا اور دل اُس (شکلِ مہتابی) کی یاد میں خون ہوتا، میں دیوانہ و مست کی مانند منھ میں کف بھرا ہوا، ہاتھوں میں پتھر لیے گرتا پڑتا، اور لوگ مجھے دیکھ کر بھاگتے۔

چار مہینے تک وہ گلِ شب افروز نت نئے انداز دکھاتا اور اپنے فتنۂ خرام سے قیامت ڈھاتا رہا۔ ناگاہ موسمِ بہار آیا تو جنوں کے داغ اور بھی ہرے ہو گئے۔ میں ایسا ہو گیا جیسے کوئی آسیب زدہ ہو، اور مطلق کسی کام کاج کا نہ رہا۔ وہ خیالی صورت ہمہ وقت نظروں کے سامنے رہتی اور اُس کی مشکیں زلفوں کا دھیان سر میں۔ لوگ مجھ سے بھاگنے لگے اور مجھے بند کر دیا۔

فخرالدین خاں کی بیوی نے جو درویش (والد) کی مرید تھیں اور قریبی رشتہ بھی رکھتی تھیں (میرے علاج) میں بہت رُپیہ خرچ کیا۔ ملاؤں سیانوں نے جھاڑ پھونک کی، اور طبیبوں نے فصد کھولی۔ بارے طبیبوں کا تیر نشانے پر بیٹھا۔ جب خریف کا موسم آیا، اور بہار رخصت ہوئی تو جنون خود بخود گھٹ گیا۔ وہ خیالی تصویر صفحۂ دل سے مٹ گئی، اور جنوں نے جو سبق پڑھایا تھا، فراموش ہوگیا۔ پریشاں گوئی موقوف ہوئی۔ دماغ کی تری کے لیے دوائیں استعمال کیں تو نیند بھی خوب آنے لگی، اور کھوئی ہوئی طاقت پھر واپس مل گئی، یعنی میں تن درست ہوگیا۔ بدخوابی جاتی رہی اور وہ چہرۂ مہتابی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جلد ہی پوری طرح صحت یاب ہوگیا اور "مکتوبات" پڑھنے شروع کر دیے۔

میر جعفر

(نقل) میں ایک دن بازار میں، ایک کتاب کے کچھ اجزا ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا کہ میر جعفر نامی ایک جوان اُدھر سے گزرے، مجھے دیکھا تو میرے قریب آئے اور تھوڑی دیر توقف کر کے کہنے لگے: "اے عزیز معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے کا تمھیں شوق ہے، میں بھی کتاب کا کیڑا ہوں، لیکن کوئی مخاطب نہیں ملتا، اگر تم چاہو تو کبھی کبھی آجایا کروں گا۔" میں نے کہا: "آپ کی خدمت کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اگر محض خدا واسطے آپ یہ زحمت گوارا کریں تو عین بندہ نوازی ہے۔" کہنے لگے: "اتنا ضرور ہے کہ تھوڑا سا ناشتا مل جائے، اِس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" میں نے کہا: "(یہ مشکل) خدائے کریم آسان کر دے گا اگرچہ میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔" اُنھوں نے اُن (منتشر) اوراق کو صفحوں کے مطابق کر کے مجھے دیا اور چلے گئے۔ اِس کے بعد اکثر اُس انسان نما فرشتے سے

ملاقات ہوتی، نہایت مہربانی سے پیش آتے یعنی اپنا دماغ کھپا کر مجھے کچھ سکھاتے، میں بھی تا بہ مقدور اُن کی خدمت کرتا یعنی جو کچھ میسّر تھا اُن کے لیے خرچ کرتا، ناگاہ اُن کے وطن یعنی عظیم آباد سے کوئی خط آیا اور وہ اُدھر چلے گئے۔

سید سعادت علی

کچھ دنوں کے بعد سعادت علی[1] نام کے ایک سیّد سے میری ملاقات ہوئی جو امروہہ کے رہنے والے تھے اور

---

[1] سیّد سعادت علی امروہہ (ضلع مراد آباد) کے محلہ حقّانی میں رہتے تھے (تاریخ اصغری)، دلّی آکر قلعے میں ملازم ہوئے، وہ حضرت شاہ شرف الدین شاہ ولایت (پیدائش ۶۶۳ھ) کی اولاد میں تھے۔ اسپرِنگر نے اُن کے والد کا نام غلام علی عشرت لکھا ہے (فہرست کتب خانہ شاہِ اودھ) لیکن اُسے دھوکا ہوا ہے، غلام علی عشرت (پدماوت کے مترجم) بریلی کے رہنے والے تھے۔ اور سعادت علی کے انتقال کے وقت پیدا بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔ غلام علی عشرت کے بیٹے کا نام بھی سعادت علی مگر تخلص عیش تھا (انتخابِ یادگار) اِسی سے اسپرِنگر کو مغالطہ ہوا۔

سعادت امروہوی ایہام کے شعر کہتے تھے اور اپنے ہم عصروں میں امتیازِ تمام رکھتے تھے، چالیس[۴۰] سال کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ تپ محرقہ میں انتقال کیا (مخزن نکات)، اُنھوں نے دیوان مرتب کر لیا تھا جس کا مطلع اوّل یہ تھا:

واللہ جو سرِ لوح ترا نام نہ ہوتا
ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

نواب قمر الدین خاں وزیر کے زمانے میں وہ عاشق معشوق "لیلیٰ مجنوں" گزرے ہیں اُن کی داستانِ عشق کو سعادت نے مثنوی کی شکل میں لکھا تھا۔ سلام و مناقب بھی کہتے تھے اور اُن کے بعض سلام بہت مشہور تھے (تذکرہ میر حسن)، تقریباً سب تذکرہ نگاروں نے اُن کا ذکر کیا ہے۔ مجموعی طور پر ۱۷۔ اشعار اُن کے دستیاب ہوئے ہیں۔

(تفصیل کے لیے: تذکرہ ہندی مصحفی ص ۱۱۶۔ تذکرہ گردیزی ص ۹۴۔ نکات الشعرا ص ۲۸۔ مخزن نکات ص ۱۸۔ تذکرہ گلزار ابراہیم ص ۱۶۱۔ تذکرہ شعرائے اُردو ص ۱۱۰۔ مجموعہ نغز ص ۲۹۸۔ سخن شعرا ص ۲۱۶۔ وغیرہ)

انھوں نے مجھے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی، جو شعر فارسی کی طرح قلعہ شاہی کی زبان میں شاعری ہے، اور اُس وقت بہت رواج پا رہی تھی، میں نے بھی بہت محنت کی اور اپنی مشق اتنی کرلی کہ شہر کے شاعروں میں مستند سمجھا جانے لگا، میرے اشعار گلی کوچوں میں پڑھے جانے لگے اور ادنیٰ و اعلا کے کانوں تک پہنچ گئے!

رعایت خاں کی ملازمت

ایک دن ماموں نے مجھے کھانے پر بلایا، اور پھٹکارنا شروع کر دیا، میں بہت کڑھا اور کھانے میں ہاتھ ڈالے بغیر اُٹھ گیا، جب اُن سے نبھتی نہ دیکھی تو شام کو اُن کے گھر سے نکلا اور جامع مسجد کا رستہ لیا، اتفاق سے راہ بھول گیا اور قاضی حوض پر آنکلا، جو وزیرالممالک اعتمادالدولہ کی حویلی کے پاس ایک چھوٹی سی نہر ہے، یہاں میں نے پانی پیا۔ اِس جگہ علیم اللہ نامی ایک شخص میرے سامنے آیا اور بولا: "تم میر محمد تقی میرؔ ہو نا؟" میں نے کہا: "تم نے کیسے پہچانا؟" بولا: "تمھارا سودائیانہ انداز تو مشہور ہے! رعایت خاں[1] نے جو عظیم اللہ خاں کا لڑکا اور اعتمادالدولہ قمرالدین خاں کا بھانجا ہے، جب سے تمھارے اشعار سُنے ہیں تم سے ملاقات کرنے کا بہت ہی مشتاق ہے۔ اگر تم میرے ساتھ چل کر اُس سے ملو، تو میرے لیے بھی باریابی کا بہانہ ہو جائے گا۔" میں جا کر ملا۔ بڑی شرافت سے پیش آیا اور مجھے اپنا رفیق بنا لیا۔ اُس (کی ملازمت) سے

---

[1] "نواب رعایت خاں، ظہیرالدولہ عظیم اللہ خاں صوبیدار مالوہ کا بیٹا تھا، جو بعد ازاں وہاں کا صدر مقرر ہوا۔ یہ عظیم اللہ خاں، رعایت خاں برادر محمد امین خاں کا بیٹا تھا۔ رعایت خاں کی ماں درالنسا بیگم ہمشیرہ اعتمادالدولہ قمرالدین خاں کی تھی۔ رعایت خاں نے قمرالدین خاں کی بیٹی سے شادی کی تھی!" (تاریخ فرخ آباد، از اردین ص ۹۸، اُردو ترجمہ)

مجھے فائدہ پہنچا اور تنگ دستی سے چھٹکارا مل گیا۔

دُرّانی کا حملہ جس زمانے میں (احمد شاہ) درّانی لاہور[1] آیا اور زکریا خاں کا لڑکا شاہ نواز خاں جو وہاں کا صوبیدار تھا بھاگ گیا، تو وزیر (قمرالدین خاں)

---

[1] احمد شاہ درّانی ہندستان میں پہلی بار نادر شاہ کے ساتھ آیا تھا (۱۷۳۹ء) اور اُس نے مغل حکومت کی زوال آمادگی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اب اُسے لاہور سے شاہ نواز خاں نے دعوت نامہ بھیجا کہ اگر آپ ہندستان پر حملہ کریں تو میں اس شرط پہ آپ کی امداد کروں گا کہ بعد حصولِ فتح مجھے عہدۂ وزارت دیا جائے۔ احمد شاہ درّانی یہ دعوت پاتے ہی وسطِ دسمبر (۱۷۴۷ء) میں پشاور سے چل پڑا، اور ۸ر جنوری (۱۷۴۸ء) کو شاہدرہ (لاہور) پہنچا۔ اسی دوران میں نواب قمرالدین خاں نے جو شاہ نواز خاں کے ماموں ہوتے تھے، اُس کے خطرناک ارادے سے آگاہ ہو کر امداد دینے کا ارادہ ترک کرا دیا۔ درّانی نے شاہ نواز خاں کو دوبارہ ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود رہی۔ مگر اس نے پیش قدمی جاری رکھی اور ۱۰ر جنوری کو راوی سے اپنی فوجیں اُتار کر شالامار باغ میں خیمہ زن ہوا۔ ۱۱ جنوری کو دونوں فوجوں میں جھڑپ ہوئی اور شاہ نواز خاں بھاگ گیا۔ جب قلعہ دہلی میں لاہور فتح ہو جانے کی خبر پہنچی، تو محمد شاہ نے جو اُن دنوں بیمار تھا، شہزادہ احمد شاہ اور نواب قمرالدین خاں اور راجا جے سنگھ سوائی والئ جے پور کے لڑکے ایشر سنگھ وغیرہ کی نگرانی میں دو لاکھ فوج بھیجی جو ۲۵ر فروری (۱۷۴۸ء) کو سرہند پہنچی، ادھر سے یہ لوگ ذرا آگے بڑھے تھے کہ لدھیانہ کے راستے سے درّانی ۲ر مارچ کو سرہند پر قابض ہو گیا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ ۱۱ر مارچ (مطابق ۲۲ر ربیع الاوّل ۱۱۶۱ھ جمعہ) کو وزیر قمرالدین خاں اپنے خیمے میں چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ناگاہ ایک گولا آ کر لگا جس سے وہ فوراً مر گئے۔

معین الملک نے اس خبر کو صیغۂ راز میں رکھا اور خود نواب قمرالدین کے ہاتھی پر سوار ہو کر مقابلے کے لیے نکلا۔ اتفاق سے درّانی کے توپ خانے کی بارود میں آگ لگ گئی اور اُس کی فوج کے ہاتھی بھاگنے لگے اور ایک ہزار فوج جل کر بھسم ہو گئی مجبوراً درّانی کو میدان چھوڑنا پڑا، اور شاہی فوج نے میدان مار لیا۔ اس کی تاریخ "فتحِ خدا ساز" (۱۱۶۱ھ) نکلتی ہے۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اور صفدر جنگ اور راجا جے سنگھ، جو ایک بڑا زمیندار تھا اُس کا بیٹا ایشر سنگھ شہزادہ احمد شاہ کو ساتھ لے کر اُس سے جنگ کرنے کے لیے نکلے۔ سرہند کے قریب وزیر (نواب قمرالدین خاں) کے گولا لگا، (تو) زمیندار مذکور (ایشر سنگھ) کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ معین الملک جو وزیر شہید کا لڑکا تھا۔ اور صفدر جنگ شہزادہ احمد شاہ کو ساتھ لے کر افغانوں سے بھڑ گئے (اور اُنھیں مار بھگایا)۔ میں اس سفر میں خان مذکور (رعایت خاں) کے ساتھ تھا۔ اور اُن کی خدمت کرتا تھا۔ جب افغانوں کی فوج بُری طرح ہار کر بھاگی تو معین الملک لاہور کا گورنر ہو گیا اور خانِ مذکور عضوِ معطل کی طرح رفاقت ترک کر کے صفدر جنگ کے ساتھ شہر (دلی) کو روانہ ہو گیا۔

محمد شاہ کا انتقال پانی پت کے قریب جو دہلی سے چالیس کوس کے فاصلے پر ایک مشہور شہر ہے، یہ خبر پہنچی کہ محمد شاہ[1] کا انتقال ہو گیا۔

(صفحہ گزشتہ سے آگے) ۹ر اپریل (۱۷۴۸ء) کو دہلی سے محمد شاہ کا فرمان پہنچا جس میں فوج کو واپس آنے کی ہدایت اور معین الملک کے نام لاہور کی گورنری کا حکم تھا۔ معین الملک اپنی وفات ۳ر نومبر ۱۷۵۳ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس کے بعد اُس کی بیوی مغلانی بیگم نے صوبے کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مگر عماد الملک نے اُسے معزول کر کے ادینہ بیگ خاں کو مقرر کر دیا۔ اور مغلانی بیگم نے احمد شاہ درانی کو مال و متاع کی لالچ دے کر پھر ہندستان آنے کے لیے لکھا۔

[1] محمد شاہ (روشن اختر)، ۷ر اگست ۱۷۰۲ء کو پیدا ہوا، اور ستمبر ۱۷۱۹ء (مطابق ذی قعدہ ۱۱۳۲ھ) میں تخت نشین ہوا، ۱۶ر اپریل ۱۷۴۸ء مطابق (۲۷ر ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ) کو اُس نے انتقال کیا۔ اور اُس کی جگہ احمد شاہ اس کا لڑکا بائیس[22] سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، وہ ادھم بائی کے بطن سے (مسلسل)

اس خبر سے تہلکہ مچ گیا۔ صفدر جنگ نے بڑے تفاخر سے چتر اور تختِ شاہی احمد شاہ کے حضور میں پیش کیا اور اُسے بادشاہ بنا دیا۔ وہ بڑے کرّ و فر سے شہر میں داخل ہوا، اس موقع پر جاوید خاں کو جو مرحوم بادشاہ (محمد شاہ) کا خواجہ سرا تھا نواب بہادر کا خطاب ملا۔ اور اختیاراتِ سلطنت اُس کے سپرد ہوئے ؎

ہر روز اختیارِ جہاں پیشِ دیگر یست
دولت مگر گداست کہ ہر روز بردریست ؎[1]

صفدر جنگ کی وزارت

جب نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں انتقال کیا تو وزارت صفدر جنگ کو ملی۔ اور سادات خاں ذوالفقار جنگ بخشی گری کے منصب پر فائز کیا گیا۔ نئے وزیر کے کرد فراد

(صفحہ گزشتہ سے آگے) تھا جو مان خاں قوّال کی بہن تھی۔ احمد شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد اُس کو نواب بائی خطاب دیا، پھر تھوڑے دنوں کے بعد نواب قدسیہ صاحب الزماں خطاب ہوا" (تاریخ اودھ: ۱/۱۳۶)
اودھم بائی جاوید خاں پر بہت مہربان تھی اسی لیے جاوید خاں کو عروج حاصل ہوا۔ اور وہ ہفت ہزاری منصب تک پہنچا۔ مغل خاندان کی تاریخ میں یہ پہلا خواجہ سرا تھا جسے اتنا بڑا اعزاز نصیب ہوا لیکن اس کے برسرِ اقتدار آنے سے طبقۂ شرفا میں بہت سخت ہیجان اور ناراضگی پیدا ہو گئی تھی۔ قلعے کے ملازمین جاوید خاں اور نواب قدسیہ کی اہانت کرتے تھے شرفانے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر کار صفدر جنگ نے ۲۷ اگست ۱۷۵۲ء کو اُسے مروا ڈالا۔ احمد شاہ کو بھی عماد الملک نے اندھا کر کے تخت سے اُتار دیا اور عالم گیر ثانی کو اُس کی جگہ تخت نشین کر دیا۔

[1] (ترجمہ) دنیا کا اختیار (حکومت و اقتدار) ہر روز دوسروں کو منتقل ہوتے رہتے ہیں، شاید دولت بھی فقیر ہی جو آئے دن کسی نہ کسی کے دروازے پر کھڑی رہتی ہو۔ (مترجم)

ٹھاٹھ باٹ اتنے تھے کہ بادشاہ کو بھی نصیب نہ تھے۔ نئے بخشی (سادات خاں) نے راجا بخت سنگھ کو جو بڑا تجربہ کار اور نام برآوردہ زمیندار تھا اور اُس کا بڑا بھائی ابھے سنگھ ریاست جودھ پور پر متمکن تھا، صوبہ اجمیر کی نیابت دے کر (بھائی کا) مقابلہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ راجا نے خان مذکور (رعایت خاں) کو فوج کا سردار بنایا اور اپنے ساتھ لے گیا۔ سامھر کے قریب جو اجمیر سے بیس کوس اِدھر ایک مشہور قصبہ ہے، دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور توپ خانے کے ساتھ جنگ چھڑ گئی۔ فریقِ ثانی کے لوگوں نے نمک حرامی کی، اور ایک دن بھی جی لگا کر نہ لڑے جان دینے کا تو ذکر ہی کیا! ناچار اُدھر کے رئیس (ابھے سنگھ) نے ملھار کو جو مرہٹوں کا نامی سردار تھا درمیان میں ڈال کر صلح کر لی اور واپس ہو گیا۔ میں صلح کے بعد خواجۂ بزرگ (حضرت معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ) کی درگاہِ مبارک کی زیارت سے سعادت اندوز ہوا، اور (اجمیر کے) نواح کی سیر کر کے واپس آ گیا۔

یہاں ایک بات پر راجا بخت سنگھ نے ناک بھوں چڑھائی اور خان (رعایت خاں) سے اس کی تو تو، مَیں مَیں ہو گئی۔[1] ستار قلی خاں کشمیری نے جو ایک ہی بہر دپیا تھا، اُسے گالیاں دیں اور نوبت لڑائی تک پہنچ گئی۔ خان نے صورتِ حال کی نزاکت دیکھ کر، اس بد کلامی کی معذرت چاہنے کے لیے مجھے بھیجا۔ میں نے جا کر اُس کی جانب سے قسم کھائی کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ مگر اُس کا دل صاف نہ ہوا۔ اس

---

[1] مولوی عبدالحق مرتب ذکرِ میر نے اس موقع پر عنوان دیا ہے: "سادات خاں ذوالفقار جنگ اور بخت سنگھ کی نزاع" لیکن سیاق و سباق کی روشنی میں یہ غلط ٹھیرتا ہے۔ "خان" سے میر کی مراد رعایت خاں ہے۔ سادات خاں نہیں! (مترجم)

نے رسالے کے لوگوں کی تن خواہ کا حساب بے باق کرکے (رعایت خاں کو) رخصت کردیا۔ بارے یہ بلا گزر گئی، خان نے بھی اس پر لعنت بھیجی۔ شہر (دلّی) آ گیا۔ اور کچھ دن اپنے گھر بیٹھا رہا۔

میری بے دماغی

ایک چاندنی رات میں خان کے سامنے ڈوم کا لڑکا چبوترے پر بیٹھا گا رہا تھا۔ (خان نے) مجھے دیکھا تو کہنے لگا:

"میر صاحب! اِسے اپنے دو تین شعر ریختہ کے یاد کرا دیجیے تو یہ اپنے ساز پر درست کرکے گا لے گا"۔ میں نے کہا "یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا" کہنے لگا: "میری خاطر سے!" چوں کہ ملازمت کا پاس تھا، طوعاً و کرہاً تعمیل کی اور پانچ شعر ریختہ کے اُسے یاد کرا دیے مگر یہ بات میری طبعِ نازک پر بہت گراں گزری۔ آخر دو تین دن کے بعد گھر بیٹھ رہا۔ اُس نے ہر چند بُلایا، نہیں گیا اور اُس کی نوکری چھوڑ دی۔ مگر اُس شخص کی مروّت نے مجھے بے روزگار دیکھنا گوارا نہ کیا۔ میرے بھائی محمد رضی کو، میرے حقوقِ رفاقت کے پیشِ نظر، اپنے پاس سے گھوڑا عنایت کیا اور نوکر رکھ لیا۔ ایک مدّت کے بعد جب میں جا کر ملا تو اُس نے بہت عُذر خواہی کی۔ میں نے کہا "خیر، گزشتہ را صلوٰۃ"!

نوّاب بہادر

جب اِسی طرح کچھ دن گزر گئے تو میں نے نوّاب بہادر کے ہاں ملازمت تلاش کی اور نوکر ہو گیا، اسد یار خاں نے جو اُس کی فوج کا بخشی تھا، میرا احوال اُسے سنا کر، گھوڑے اور نوکری کی شرط معاف کرا دی۔ وہ (نوّاب بہادر) میرا بڑا لحاظ اور بہت امداد و اعانت کرتا تھا۔ خدا اُسے جزائے خیر دے۔

فرخ آباد کا سفر جن دنوں محمد خاں بنگش کا لڑکا قایم خاں روہیلوں کی جنگ میں مارا گیا اور صفدر جنگ اُس کے املاک کی ضبطی کے لیے روانہ ہوا[1] میں بھی ایک تقریب سے اسحاق خاں نجم الدولہ کے ساتھ اُس طرف کی

---

[1] نواب قایم خاں بنگش (والی فرخ آباد) سے صفدر جنگ کی پرانی عداوت تھی اور وہ بنگش خاندان کو ملیامیٹ کرنے کے منصوبے بہت دنوں سے بنا رہا تھا۔ آخر اس نے یہ ترکیب کی کہ روہیل کھنڈ کی گورنری کا فرمان بادشاہ سے لکھوا کر قایم خاں کے نام بھیج دیا اور یہ لکھ دیا کہ اس علاقہ پر تم قبضہ کر لو۔ نواب محمد علی روہیلہ کا انتقال ہو چکا تھا (۱۱۶۲ھ) اور حافظ رحمت خاں اُن کے علاقے کا انتظام کر رہے تھے۔ نواب سعد اللہ خاں کو انھوں نے محمد علی روہیلہ کے مسند پر بٹھا رکھا تھا۔ حافظ رحمت خاں نے قایم خاں کو بہیترا سمجھایا کہ روہیل کھنڈ پر حکومت کرنے کا خیال ذہن سے نکال دو۔ یہ صرف صفدر جنگ کی ایک چال ہے اور وہ اس طرح خاندان بنگش اور روہیلوں میں عداوت و نفاق کا بیج بونا چاہتا ہے، مگر صفدر جنگ کی شہ پر قایم خاں نے پیش قدمی جاری رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مارا گیا (۱۵ ذی الحجہ ۱۱۶۲ھ مطابق نومبر ۱۷۴۹ء) حافظ رحمت خاں نے اس کی نعش فرخ آباد بھجوا دی۔

اب صفدر جنگ دہلی سے فرخ آباد پر قبضہ کرنے کی نیت باندھ کر نکلا (۳۰ ذی الحج ۱۱۶۲ھ) اور قایم خاں کی والدہ کو دھوکا دے کر اپنے خیمے میں بُلا لیا اور اُسے مع چھ فرزندوں کے گرفتار کر کے اس کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا۔ پھر راجا نول رائے کو وہاں کا حاکم مقرر کر کے واپس آ گیا۔

ادھر قایم خاں کے بھائی احمد خاں نے رستم خاں آفریدی کی مدد سے فوج جمع کی اور راجا نول رائے کو قتل کر کے اس کی فوج کو لوٹ کھسوٹ کر مار بھگایا۔

یہ سن کر صفدر جنگ آگ بگولا ہو گیا اور اسّی ہزار فوج لے کر دہلی سے نکلا (۲۳ جولائی ۱۷۵۰ء) سورج مل جاٹ، نجم الدولہ اسحاق خاں وغیرہ اس کی مدد کے لیے ہمراہ تھے۔
(باقی)

کی سیر کرنے گیا۔ قایم خاں کے چھوٹے بھائی احمد خاں سے بڑی بھاری جنگ ہوئی۔ وزیر کی فوج نے منھ کی کھائی اور اسحاق خاں بھی قتل ہوتے۔ میں اُس ہارے ہوئے لشکر کے ساتھ بڑی زحمت اُٹھا کر شہر (دلّی) واپس آ گیا۔ وزیر نے دوبارہ لشکر کشی کی اور افغانوں کو پچھاڑ کر پوری فتح و ظفر مندی کے ساتھ حضور (شاہ) میں آیا۔

غازی الدّین فیروز جنگ جن دنوں ذوالفقار جنگ میر بخشی، نواب بہادر کی دشمنی کے باعث اپنے عہدے سے معزول ہوا اور امیر الامرائی کا منصب غازی خاں فیروز جنگ پسر آصف جاہ کو ملا۔ وہ صوبہ دکھن کا انتظام کرنے کے لیے روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں ہیضے میں مبتلا ہوا اور مر گیا۔ بخشی گری کی خدمت اُس کے بیٹے عماد الملک کو ملی۔ میں اُن دنوں سب سے کنارہ کش ہو کر مطوّل پڑھنے میں لگ گیا۔

(صفحہ گزشتہ سے آگے) میر بھی اسی لشکر میں اسحاق خاں کے ساتھ گئے تھے۔ جٹوٹی (متصل سہادر) کے مقام پر فرخ آباد سے چند کوس ادھر میدانِ کارزار گرم ہوا۔ اسحاق خاں مارا گیا اور صفدر جنگ بھی زخمی ہوا۔ فوجیں بری طرح پسپا ہو کر دہلی آ گئیں۔

سنہ ۱۷۵۱ء میں صفدر جنگ نے ملہار راؤ ہلکر اور اپا سیندھیا مرہٹہ سرداروں کو کثیر رقم کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور دو لاکھ فوج لے کر دوبارہ فرخ آباد پر حملہ کیا۔ اس بار احمد خاں بنگش کو شکست ہوئی۔ لیکن اس شرط پر صلح ہو گئی کہ احمد خاں، صفدر جنگ کو پچاس لاکھ رُپے بطور تاوانِ جنگ اور پانچ لاکھ سالانہ شاہی خراج ادا کریں گے۔

(تاریخ فرخ آباد: اردین و حیات حافظ رحمت خاں)

مہانراین دیوان وزیر کی ملازمت

جب صفدر جنگ نے دھوکا دے کر نواب بہادر (جاوید خاں) کو مروا ڈالا[1] تو بڑا ہنگامہ ہوا' میں بھی بے روزگار ہو گیا۔ وزیر کے دیوان مہانراین نے اپنے داروغہ دیوان خانہ میر نجم الدین علی سلاؔم کے ہاتھ جو میر شرف الدین علی پیامؔ کے بیٹے تھے، کچھ (نقد) بھیجا' اور بڑے اشتیاق سے مجھے بُلایا۔ میں نے بھی اس سے تمتع کیا اور کچھ مہینے فراغت سے بسر ہو گئے۔

ابھی مظلوم خواجہ سرا کے خون کا قضیہ ختم نہیں ہوا تھا کہ زمانے نے ایک اور فتنہ اُٹھایا اور ایک نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یعنی وزیر کو کچھ شبہات پیدا ہوئے اور اُس نے بادشاہ سے بغاوت کر دی۔ ہر چند صلح کی کوشش کی گئی، مگر اُس نے امارت کے گھمنڈ میں اپنا سر نیچا نہیں کیا۔ مجبوراً بادشاہ نے اُسے سزا دینے کا ارادہ کیا۔ وہ (صفدر جنگ) شہر سے نکل کر اپنے خداوند نعمت (احمد شاہ) سے جنگ کرنے پر تُل گیا۔ اِدھر عماد الملک جو آصف جاہ کا پوتا اور منصب بخشی گری پر مامور تھا، نیز اُس کے ماموں اور اعتماد الدولہ (قمر الدین خاں) شہید کے لڑکے انتظام الدولہ اور شاہی فوج کے دوسرے سرداروں نے شہر کی حفاظت کی۔ پرانا شہر تو سب تاراج ہو گیا۔ چھ مہینے تک جنگ جاری رہی۔ اگرچہ اُس سے لڑنے میں کسی صلے کی توقع نہ تھی، لیکن شاہی فوج نے ایسی جی توڑ کوشش کی کہ میدان مار لیا' اور باغی وزیر کے پانو اُکھڑ گئے۔ مجبور ہو کر اُس نے

---

[1] ۲۷ اگست ۱۷۵۲ء

صلح کا پیغام بھیجا۔ بادشاہ نے اُس کی شکست ہی کو غنیمت جان کر اُسے اِس کے صوبے (اودھ) کی گورنری مرحمت کر دی۔ اور وزیر انتظام الدولہ[1] ہوا۔

امیر خاں کی حویلی میں

انھیں دنوں میں زمانے کی نامساعدت سے تنگ آکر میں نے ماموں (سراج الدین علی خاں آرزو) کی ہمسائگی ترک کر دی یہ سوچ کر کہ وہ مجھے ہلکی نظر سے دیکھیں گے۔ اور امیر خاں[2] مرحوم کی حویلی میں سکونت اختیار کی، (جو محمد شاہی عہد کے بڑے امیر تھے اور سلطنت کی دکھتی ہوئی رگ اُن کے ہاتھ میں تھی، نیز الہ آباد کی صوبہ داری بھی اُن کے سپرد تھی۔ تخلص اُن کا انجام ہے۔ اپنی خوش سلیقگی و شیوا بیانی کے لیے ضرب المثل ہیں۔ محمد علی روہیلہ کی مہم کی کامیابی کا سہرا اُنھیں کے سر ہے، اُنھوں نے بادشاہ کو نکال کر اُسے قید کیا تھا۔ آخر کار اپنے ایک ملازم کے ہاتھ سے دیوان خاص کے دروازے پر مارے گئے)، اُن کی حویلی میں منتقل ہو کر بُری بھلی بسر کرتا رہا۔

عماد الملک نے تھوڑے ہی عرصے میں فوج جمع کر کے، اور مرہٹہ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا کر صفدر جنگ کی حمایت کے جرم میں سورج مل[3] پر چڑھائی کر دی، جو ایک

---

[1] انتظام الدولہ نواب قمر الدین خاں وزیر (۴۷ء) کا بڑا لڑکا تھا۔ مارچ ۱۷۵۳ء میں وزیر ہوا۔ اور مئی ۱۷۵۴ء تک پندرہ مہینے اس عہدے پر متمکن رہا۔ عماد الملک نے اسے قتل کرا دیا تھا۔

[2] یہ نعمت اللہ ولی کی نسل سے تھے اور زیادہ تر ہیلیاں کہتے تھے، امیر خاں نام اور عمدۃ الملک خطاب تھا۔ محمد شاہ کے جلیس خاص تھے اور "بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا کہ ایک دم کی جدائی اُن کی جہاں پناہ کو شاق تھی اور آٹھ پہر طبیعت اُن کی طرف مشتاق تھی" (گلشنِ ہند ص ۱۴۰) نہایت ظریف، لطیفہ گو، شیریں کلام اور حاضر جواب تھے۔ موسیقی اور گانے میں بڑا درک تھا، فارسی اور ریختہ دونوں میں شعر کہتے تھے۔ شاعروں کے قدر دان بھی تھے۔ شاعروں میں شرف الدین مضمون (باقی)

طاقت ور زمین دار تھا۔ اور اس کے قلعے کا محاصرہ کر کے اُسے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ملھار راؤ کا لڑکا اسی جنگ میں مارا گیا۔ سورج مل کی صفدر جنگ سے خط و کتابت تھی یہی بات باہمی جنگ کا سبب بنی۔ بادشاہ بھی شہر سے نکلا اور دریائے جمنا سے بیس میل اُدھر سکندر آباد کے قریب ڈیرے ڈالے۔ ایک شام یہ خبر ملی کہ سردارانِ دکن، اور عماد الملک نے سورج مل سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور وہ شاہی لشکر کو لوٹنے کے لیے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر چل پڑے ہیں بس پہنچا ہی چاہتے ہیں! بادشاہ نے صمصام الدولہ

(بقیہ گزشتہ سے آگے) خواجہ ناصر عندلیبؔ، قائمؔ چاند پوری، میر ضاحکؔ دہلوی، شاہ حاتمؔ، نواب محمد خاں شاکرؔ، بندرابن خوش گو، نواب عنایت خاں راسخؔ، ہندی کے کویوں میں صورت مصرؔ، اعظم خاںؔ، انند گھنؔ اور دیوی کویؔ اُن کے ہم نشینوں میں تھے۔ میر محمد شاکر ناجی ان کے داروغہ دیوان خانہ تھے (نگل رعنا ص ۱۰۷) خوش گو نے "سفینہ خوش گو" اور "تذکرۃ المعاصرین" لکھ کر نواب کی خدمت میں پیش کیا تو ازراہِ قدر دانی دو روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر فرمایا (معارف جلد ۳ نمبر ۲ ص ۶۰) اسپرانگر نے سال وفات ۱۱۵۹ھ لکھا ہے۔ جو ۱۸ اپریل ۱۷۴۵ء کے مطابق ہے۔ انجامؔ کے باپ عہد عالمگیری میں کابل کے صوبے دار تھے، محمد شاہ نے الہ آباد کی صوبہ داری اِنھیں مرحمت کی۔ "ان کا ایک خاص احسان اُردو پر یہ ہے کہ اس زبان کی ترقی کے لیے اپنی نگرانی میں ایک انجمن بھی قایم کی جس میں وقت کے فضلا اور زبان داں شریک ہوتے اور الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بڑے رگڑے جھگڑوں اور چھان بین کے بعد اس انجمن کے دفتر میں الفاظ و محاورات درج ہوتے۔ اور پھر سارے ہند میں اُس کی نقل بھیج دی جاتی اور دیگر امرا اسی امیر کی تقلید کو فخر مانتے"۔ (خطبہ صدارت نواب نصیر حسین خیالؔ بحوالہ مختصر تاریخ ادب اردو: اعجاز حسین، طبع پنجم ص ۴۷) انجامؔ بھاشا اور سنسکرت کے بھی عالم تھے۔ محمد شاہ کے زمانے ہی میں اُن کی جاگیر ضبط ہو گئی تھی جس میں بڑا نادر کتب خانہ بھی تھا، وہ سب برباد ہو گیا۔

؎ سورج مل جاٹ، بدن سنگھ کا بیٹا اور بھرت پور کا والی تھا۔ اُس زمانے میں اپنی طاقت بڑھا کر آگرہ، متھرا اور علی گڑھ کے علاقوں پر قابض ہو گیا تھا۔

میرِ آتش اور چند دوسرے نمک حراموں کے کہنے میں آکر جو بخشی گری کے عملے سے سازش کر چکے تھے، اپنی عزت کا بھی پاس نہ کیا اور مضطرب و سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا، وہاں صبح ہوتے تک، دکنی فوج آگئی اور سارے لشکر کو لوٹ لیا۔ پھر اُن کے تعاقب میں آئے اور دریا (جمنا) کے اُس طرف خیمے نصب کیے۔

عالمگیر ثانی نئے انتظام میں بادشاہ کے لوگوں میں سے کوئی بھی قلعے میں نہ رہا، اگرچہ وہ نمک حرام پہلے ہی نکل بھاگے تھے۔ اس بندوبست کے بعد عماد الملک نے قلمدانِ وزارت سنبھال لیا۔ بدھو وزیر (صفدر جنگ) مارے بزدلی کے کونے میں جا دبکا۔ اور بادشاہ حواس باختگی کے عالم میں باغ کی طرف نکل گیا۔ کچھ دیر بعد غداروں نے لوٹ مار شروع کر دی اور اُس (بادشاہ) کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر بہادر شاہ کے پوتے کو عالمگیر ثانی[1] کے نام سے تخت پر بٹھا دیا۔ بہت سے نالائق اور کمینے لوگ برسرِ اقتدار آگئے۔ جو کچھ ہوا بے جا ہوا۔ صمصام الدولہ جو عقل سے بالکل کورا تھا امیر الامرا بن بیٹھا۔ میں اس سفرِ وحشت اثر میں احمد شاہ کے ساتھ تھا۔ واپس آکر گوشہ نشین ہو گیا۔

ماموں کا سفر لکھنؤ اس زمانے میں جب صفدر جنگ نے وفات پائی اور صوبے

---

[1] احمد شاہ کو ۱۷۵۴ء میں اندھا کر کے تخت سے اُتارا گیا۔ اور اُس کی جگہ عالمگیر ثانی کو ۵۵ سال کی عمر میں تخت نشین کیا۔ وہ جب سے فرخ سیر برسرِ اقتدار آیا تھا (۱۷۱۳ء) بہت غریبی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے مذہبی کتابوں اور تصوف و تاریخ کا اچھا مطالعہ کیا تھا اور اورنگ زیب کی طرح نظمِ حکومت کرنا چاہتا تھا، مگر اس کی ناتجربہ کاری اور اس کے درباری امراء کی نااہلی نے اُسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ بالآخر اُسے عماد الملک نے دھوکے سے قتل کرا دیا۔ جس کا حال میر نے آگے لکھا ہے۔

داودھ) کی ریاست اُس کے بیٹے شجاع الدولہ کو ملی۔ میرے ماموں (خان آرزد) لالچ کے مارے نکل پڑے یعنی شجاع الدولہ کے لشکر میں اِس توقع پر گئے کہ اسحاق خاں شہید کے بھائی وہاں ہیں وہ حقوقِ سابق کا خیال کر کے کچھ مراعات دیں گے۔ مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قسمت نے دھکا دیا تھا، وہیں مر گئے۔[1] اُن کی نعش وہاں سے لاکر اُنھیں کی حویلی میں سپردِ خاک کی گئی۔

راجا جگل کشور دو تین مہینے کے بعد راجا جگل کشور جو محمد شاہ کے زمانے میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑی جاہ و حشمت کے ساتھ رہتے تھے، مجھے گھر بلا کرلے گئے اور اپنے اشعار پر اصلاح کی خدمت سپرد کی۔ مگر میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھی اور اُن کی اکثر تصنیفات پر خط کھینچ دیا۔

راجا ناگرمل اس زمانے میں راجا ناگرمل جو فردوس آرام گاہ کے عہد میں دیوانی خالصہ وتن پر فائز تھے۔ نیابتِ وزارت پر سرفراز ہوئے۔ مہاراجگی اور عمدۃ الملکی کا خطاب پایا۔ چوں کہ وہ شہر کے مظلوموں کو اپنے گھر میں پناہ دیتے اور اُن کی فریاد سُنتے تھے، بہت سے لوگ اُن کے دشمن ہو گئے۔ اگر وہ دربار میں جاتے تو خود بھی بڑی احتیاط کے ساتھ مسلح ہو کر، اور اُن کی فوج بھی چوکنی رہتی۔ اِس طرح بدخواہوں کے فریب سے محفوظ رہتے اور شان و شوکت سے بسر کرتے تھے۔ اِسی زمانے میں صمصام الدولہ یعنی موجودہ میر بخشی سِل کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ اور اُن کا لڑکا جو جاہلِ محض ہے اُن کے عہدے پر مقرر ہوا۔

---

[1] ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ مطابق ۲۷ جنوری ۱۷۵۶ء سہ شنبہ۔

ابدالی کے حملے

اسی اثنا میں احمد شاہ درّانی[1] جو سرہند سے شکست کھا کر واپس ہو گیا تھا، اور ہندستان فتح کرنے کی برابر ترکیبیں لڑا رہا تھا، بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ لاہور آیا۔ وہاں کے وضیع و شریف لوگوں نے کون سا ستم تھا

---

[1] احمد شاہ ابدالی دسمبر ۱۷۴۹ء میں پھر دریائے چناب پار کر کے ہندستان پر حملہ کرنے کی نیت سے آ پہنچا تھا اس نے معین الملک کو چہار محل (گجرات۔ اورنگ آباد۔ پسرور سیالکوٹ) کے خراج کے لیے لکھا جو محمد شاہ نے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کو دیے تھے معین الملک نے ابدالی کا یہ خط دہلی بھیج دیا جہاں سے اندرونی سازشوں کے شکار عیش پرست بادشاہ نے خراج ادا کرنے کا وعدہ لکھ بھیجا معین الملک نے شاہی خط دکھا کر احمد شاہ کو ٹال دیا تھا۔

لیکن ابدالی کو اندازہ تھا کہ موعودہ وقت میں یہ خراج ادا نہیں کر سکے گا چناں چہ ایسا ہی ہوا جب میعاد گزر گئی اور رُپیہ نہ پہنچا تو احمد شاہ نے پہلے اپنے سفیر بھیجے۔ معین الملک نے عذر کیا۔ مگر حملے کی دھمکی میں آ کر نو لاکھ رُپیہ ادا کر دیا اور باقی کے لیے وعدہ کر لیا کہ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے واپس ہو جانے پر ادا کر دوں گا۔ ابدالی نے ۹ لاکھ تو خزانے میں جمع کیے اور حملہ کرنے کا ارادہ ملتوی نہ کیا۔ (۱۷۵۱ء) معین الملک بھی پچاس ہزار فوج لے کر راوی کے پار پہنچ گیا۔ لیکن ابدالی دوسرے راستے سے لاہور کی طرف چل کھڑا ہوا۔ معین الملک جلدی سے لاہور واپس آیا۔ ابدالی نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور یہ چار مہینے تک جاری رہا۔ رسد کی پریشانی سے عاجز آ کر معین الملک نے ہتھیار ڈال دیے۔ (مارچ ۱۷۵۲ء) لیکن ابدالی معین الملک کی ہمت، شجاعت اور اپنے آقا کی وفاداری سے اتنا خوش ہوا کہ لاہور کی گورنری اپنی طرف سے اُسے عطا کی۔ اِدھر عبد اللہ خاں کی سرکردگی میں کشمیر فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی اور وہاں کے گورنر ابو القاسم خاں کو شکست دے کر سکھ جیون لال کو اپنی طرف سے گورنر مقرر کر دیا۔

لاہور پر اس کے بعد معین الملک تقریباً ۱½ سال تک اطمینان سے حکومت کرتا رہا۔ ۳ نومبر ۱۷۵۳ء کو اچانک اُس کا انتقال ہو گیا۔

جو نہ جھیلا، اور کون سی جفا تھی جو نہ سہی۔ کوئی روکنے والا تو تھا نہیں، وہاں سے (ابدالی نے) دلی کا قصد کیا، معین الملک پہلے ہی مغلوب ہو چکا تھا۔ اور کچھ دنوں کے بعد گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ (ابدالی کی) آمد آمد سے سب کے اوسان خطا ہو گئے بادشاہ اور وزیر سے کچھ بن نہ پڑا، آخر اس کی پذیرائی کے لیے بڑھے، اور قید کر لیے گئے۔ راجا ناگر مل، بعض امرا مثل سعد الدین خاں، خان ساماں وغیرہ کے ساتھ اپنی حفاظت کے لیے سورج مل کے قلعوں میں چلا گیا۔ تقریباً ایک مہینے تک شہر میں رسد کی تنگی رہی۔ اس کے بعد (ابدالی) نے عالمگیر (ثانی) کو سلطنت سپرد کی، اور وزیر (عماد الملک) کو ساتھ لے کر آگرے کا رخ کیا۔ اس کی فوجوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ متھرا، جو شہر (آگرہ) سے اٹھارہ کوس اِدھر بڑا بارونق اور آباد شہر تھا، سب قتل ہو گیا۔[1] جب ہوا متعفن ہو گئی تو شاہ (ابدالی) نے طاعون کے خوف سے

---

[1] جب معین الملک کا انتقال ہو گیا (۳ نومبر ۱۷۵۳ء) تو اس کی بیوی مغلانی بیگم نے صوبے کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مگر عماد الملک نے اسے معزول کر کے آدینہ بیگ خاں کو حاکم مقرر کر دیا۔ (مارچ ۱۷۵۶ء)، مغلانی بیگم نے ابدالی کو بلا بھیجا۔

ابدالی قندھار سے چل کر ۲۰ دسمبر (۱۷۵۶ء) کو لاہور پہنچا، اور ۱۰ جنوری (۱۷۵۷ء) کو ستلج عبور کر کے بغیر کسی روک ٹوک کے ۲۸ جنوری کو دلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس کی فوجوں نے ایسی لوٹ مار کی اور دست ظلم و تعدی دراز کیا کہ میر نے اس کتاب میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا ہے۔

عماد الملک سے ابدالی نے زر و جواہر پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس نے اپنے افلاس کا رونا رویا تو ابدالی نے اسے اور اس کے ملازموں کو ایذائیں دیں پھر انتظام الدولہ طلب کیا گیا جو نواب قمر الدین خاں کا لڑکا تھا اور اس سے ایک کروڑ روپے کا مطالبہ کیا اس نے بھی حیل حجت کی تو اسے "چوبہائے قنیجی" سے ایذا دینے کی دھمکی دی گئی جو ابدالی کے سامنے فرش پر لگی ہوئی تھیں۔ تب اس نے کہا کہ شولاپوری بیگم کو خزانے کا علم ہو گا۔ یہ بیگم ایک وزیر (انتظام الدولہ) کی ماں دوسرے (باقی)

سورج مل کے معاملے کو ملتوی کر کے دفعتاً کوچ کر دیا۔ اور محمد شاہ کی بیٹی سے عقد کر کے بالا بالا نکل گیا۔ عماد الملک، آگرے کے نواح میں رہ گیا۔ نجیب الدولہ، جو صفدر جنگ کی لڑائی (کے زمانے) میں وزیر کا ملازم ہوا تھا، نمایاں ترقی کر کے میر بخشی اور مختارِ سلطنت

(بقیہ) ' (قمر الدین خاں) کی بیوی اور تیسرے وزیر (محمد امین خاں) کی بہو، اسی وقت بلائی گئی اور اُسے دھمکایا گیا کہ ناخنوں میں کیلیں ٹھونکی جائیں گی ورنہ قمر الدین خاں کے دفینے کا پتا بتاؤ! شولا پوری بیگم نے نشان بتایا تو سو آدمیوں نے چھ گھنٹے لگاتار محنت کر کے قمر الدین خاں کا مکان کھود پھینکا اور ۱۶ لاکھ روپے نقد نیز بے شمار سونے چاندی کے ظروف نکال لیے (۴ فروری ۱۷۵۷ء)

لاکھوں بے گناہ عورتوں کی عصمتیں اور ہزاروں امیروں کی دولت و عزت لوٹنے کے بعد احمد شاہ نے جنوب کی طرف کوچ کیا۔ ۲ مارچ (۱۷۵۷ء) کو بلبھ گڑھ کا قلعہ فتح کر لیا' یہاں قتل و غارت کا وہ بازار گرم ہوا کہ سپاہی مقتولوں کے سروں کو نوٹوں کی طرح جمع کرتے اور صبح ہی ان سروں کی گٹھریاں لے کر وزیر کے خیمے پر آجاتے تھے جہاں انھیں ایک سر پر پانچ روپے انعام ملتے تھے۔ اور شرفا کی بہو بیٹیوں کی ایسی بے توقیری ہوئی کہ جن مغویہ عورتوں سے ابدالی کے سپاہی زنا کرتے تھے، ان کی فریاد و فغاں سے راتوں کو کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اُدھر ابدالی نے نجیب خاں اور جہاں خاں کو فوجیں دے کر متھرا فتح کرنے بھیج دیا۔ وہاں بھی بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں کا قتل عام ہوا سارے بازار لوٹ لیے گئے، تمام مکان جلا دیے اور ہفتوں تک سڑکوں پر لاشیں سڑتی رہیں، اتنا خون بہایا گیا تھا کہ جمنا کا پانی سرخ ہو گیا تھا۔

۲۱ مارچ کو جہاں خاں نے آگرے پر قبضہ کر کے بیس ہزار سے زائد انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

قتل و غارت کی زیادتی کا معمولی سا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ فضا اس قدر متعفن اور پانی ایسا خراب ہو گیا کہ ابدالی کی فوج میں ہیضہ پھیل گیا اور ڈیڑھ سو سپاہی روز مرنے لگے۔ مجبوراً ۲۸ مارچ کو ابدالی نے پڑاؤ اٹھایا۔ اور ہندستان سے چلے جانے کا قصد کیا۔

پہلے احمد شاہ نے اپنے لڑکے تیمور شاہ کی شادی عالمگیر ثانی کی ۱۶ سالہ لڑکی سے رچائی تھی اب واپسی میں اُس نے محمد شاہ کی لڑکی حضرت بیگم سے زبردستی نکاح پڑھوا لیا۔ (اپریل، ۱۷۵۷ء)

(باقی)

بن گیا۔

نجیب الدولہ سے جھڑپ اِدھر راجا ناگرمل دکن کے سردار (مرہٹوں) سے مل گیا۔ وزیر (عماد الملک) اور احمد خاں اور اُن (مرہٹوں) کو نجیب الدولہ پر چڑھا لے گیا۔ وہ (نجیب الدولہ) شہر بند ہو گیا۔ توپ خانے کی جنگ ہوئی۔ بعض سردار جو اپنے مطلب سے لڑ رہے تھے۔ ذرا سا غلبہ پانے پر شہر کی لوٹ کا قصد کرتے تھے۔ راجا مذکور جس کا منشا وزیر کی نیک نامی کے سوا کچھ نہ تھا۔ انھیں لوٹ مار سے باز رکھتا اور کہتا تھا کہ شہر کو لوٹنا نامناسب ہو دکنی فوج سب کی عزت و ناموس خاک میں ملا دے گی۔ تمھیں اس بات کا ابھی تجربہ نہیں ہو، ایسا نہ ہو کہ شہر غارت ہو جائے اور بدنامی سر تھُپ جائے! بہتر یہ ہو کہ ہم روہیلوں سے صلح کر لیں اور شہر کو محفوظ رہنے دیں۔ پایانِ کار نجیب الدولہ سے صلح کر لی اور اُسے شہر سے نکال لائے۔ وہ سہارن پور چلا گیا جو اُس کی فوج داری میں تھا۔ وزیر اور اُس کے دوسرے ساتھی شہر میں داخل ہوئے۔ دکنی فوج کو رخصت کر دیا۔

(بقیہ) یہاں سے ابدالی کا قافلہ قندھار کی طرف چلا تو مالِ غنیمت ۲۸ ہزار اونٹوں، ہاتھیوں، خچروں اور بیل گاڑیوں پر لدا ہوا تھا۔ ساری فوج پیدل چل رہی تھی کیوں کہ ان کی سواریوں پر مال و اسباب تھا۔ دلی میں جانور عنقا کا حکم رکھتے تھے کیوں کہ ابدالی نے چلتے وقت دلی میں مریل گدھا بھی نہیں چھوڑا تھا۔

اُس نے سرہند کے علاقے کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا، اور عبدالصمد خاں کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ نجیب الدولہ کو اپنا مختار بنا کر دہلی میں چھوڑ گیا۔ اپنے بیٹے تیمور شاہ کو لاہور کا حاکم اور جہاں خاں کو اس کا نائب بنا کر قندھار واپس ہوا۔

میر نے ابدالی کے تیسرے اور چوتھے حملے کو مخلوط کر دیا ہو۔

توپ خانے کی داروغگی راجا کے لڑکے کو تفویض ہوئی اور احمد خاں میر بخشی ہو گیا۔

راجا جگل کشور

ایک دن، میں نے راجا جگل کشور کے سامنے روزگار کی شکایت کی، وہ عزیز شرم سے پیلا پڑ گیا، کہنے لگا: "میں خود مفلس ہوں، کچھ بھی ہوتا تو ہرگز تامل نہ کرتا۔" ایک دن سوار ہو کر راجا ناگر مل کے ہاں گیا اور میرا تعارف کرا کے بلوا بھیجا۔ میں گیا اور اُس کے وسیلے سے ملاقات کی۔ بہت لُطف و عنایت سے پیش آیا، کہنے لگا: "دعوتِ شیراز حاضر ہے، یعنی تمھارا حصہ بھی تمھیں پہنچتا رہے گا۔" مجھے اطمینان ہو گیا تو اُٹھ کر واپس آیا۔ دوسرے دن ملاقات میں جب شعر خوانی ہوئی تو کہنے لگا: "میر کا ہر شعر موتیوں کی لڑی ہے، مجھے اِس شخص کا اسلوب بہت پسند ہے۔" ایسے ہی میں کبھی کبھار جاتا رہا، مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔

چوں کہ چاقو ہڈی تک پہنچ گیا تھا (یعنی فقر و فاقہ کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو گئی) اضطراب بہت بڑھ گیا۔ ایک دن صبح کی نماز کے بعد اُس کے دروازے پر پہنچ گیا۔ چوبداروں کا میرِ دہ جو سنگھ نامی میرے سامنے آیا اور کہنے لگا: "یہ دربار کا کون سا وقت ہے؟" میں نے کہا: "اضطرار کا عالم ہے!" بولا: "تم لوگوں کو درویش کہتے ہیں، تم شاید یہ نہیں جانتے کہ لایتحرک ذرۃ الا باذن اللہ (ایک ذرہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا)، یہاں اپنی ریاست کے آگے تمھاری کسے فکر ہے! صابر و شاکر رہنا چاہیے۔ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے یہاں تو تمھاری رسائی مشکل ہے، البتہ اُن کے بڑے لڑکے مل سکتے ہیں۔ میں نہایت شرمندہ ہوا، اور واپس آ گیا۔

ایک رات اُس (دربان) کے کہنے کے مطابق (راجا کے) لڑکے سے ملنے گیا۔ دربان نے روک دیا۔ بولا: "اِس وقت اُن سے ملاقات کرنا ممکن نہیں۔"

مجبوراً واپس آگیا۔ پھر عشا کی نماز کے بعد گیا، دیکھا تو ڈیوڑھی پر دربان نہیں ہے، میں نے پوچھا: "دربان کہاں گیا"۔ لوگوں نے کہا: "آج اُس کے سر میں ایسا شدید درد تھا کہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔" میں نے سوچا کہ تائیدِ الٰہی شاملِ حال ہے، دیوان خانے میں داخل ہوا، اور ملاقات کی۔ شعر خوانی کا بھی اتفاق ہوا۔ خواجہ غالب نے جو ایک بااثر آدمی اور مجھ سے واقف تھا، میرا احوال مفصل سنایا اور کچھ مقرر کرا دیا جو میں ایک سال تک پاتا رہا۔ ایک رات راجا کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے میری ایک سال کی تن خواہ دے کر فرمایا "اکثر مجھ سے ملتے رہا کیجیے۔" اُس دن سے عشا کی نماز کے بعد ملازموں کے طریقے سے اُن کے پاس باغ میں جاتا، اور دو گھڑی رات گئے تک رہتا تھا۔ اِس خدمت کا پھل یہ تھا کہ چین سکھ سے گزر اوقات ہو رہی تھی۔

اب میرا قلم بات کا رُخ بدل کر دوسری طرف چلتا ہے:

(سانحہ) دکن کے سردار ملک کو اپنا سمجھتے تھے، اور بادشاہ سے جنگ کرنے کے منصوبے گانٹھ رہے تھے۔ شاہ درّانی کے لڑکے تیمور شاہ اور سردار فوج جہاں خاں کی فوج کے کم ہونے کا علم ہوا تو اُن کی پشت پناہ (طاقت) کی پروا نہ کرتے ہوئے لاہور پر دھاوا بول دیا۔ شاہی فوج جنگ کی تاب نہ لا کر بھاگ گئی، اور یہ لوگ (مرہٹے) دریائے اٹک تک قابض ہو گئے۔ صاحبا نامی سردار کو وہاں کا انتظام سونپ کر اپنے ملک یعنی دکن چلے گئے۔

چند اَور سانحے چوں کہ میں اِن سانحات کو مختصر کر کے لکھنا چاہتا تھا اس لیے بہت سی باتیں، مثلاً: عماد الملک کا شجاع الدولہ پر آنکھ کرنی

کرنا اور راجا کا صلح کرا دینا، بدخشیوں کی سرتابی کا ہنگامہ اور وزیر، راجا اور نجیب خاں کی جرأت سے اُن کا مغلوب ہونا، اور وزیر (عمادالملک) کا اپنے خسر معین الملک کی املاک ضبط کرنے کے لیے لاہور جانا اور صوبہ دار مذکور (معین الملک) کی بیوی کو وہاں سے نکال[1] دینا، عاقبت محمود کشمیری کو مار ڈالنا، اور ستار قلی خاں کشمیری کا مارا جانا، شہرِ دہلی کی بربادی، اور ایسے نالائقوں کے ہاتھوں لوگوں کے گھر بار کا تباہ ہونا جو حکومت کے کاموں میں تازہ دخیل تھے۔ اور اُن احمقوں کا خدا کی لاٹھی سے غافل ہونا اور عالی گہرؔ (شاہ عالم) جس پر اب بادشاہ ہونے کی تہمت ہے، مگر فرنگیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے، اُس کا سردارانِ دکن میں سے ایک کے ساتھ جانا، اور کچھ دنوں کے بعد اپنے باپ کی خدمت میں شہر پہنچنا، اور اُس کی پذیرائی کے لیے راجا کا جانا، یاروں کا غدر مچانا، اور اُس کا زخمی ہو کر پورب کی طرف جانا، وہاں سختیاں اُٹھانا (پھر) بادشاہ ہونا، اور انتظام الدولہ خانِ خاناں کو قید کرنا اور کچھ نا اہلوں کے کہنے سے شہزادوں کو قلعے سے نکال دینا، پھر اُن کا ایسی رسوائی کے ساتھ جو ناقابلِ تحریر ہے، واپس آنا۔ یہ سب باتیں میرے قلم نے تفصیل سے نہیں لکھیں، کیوں کہ اِس مختصر کتاب میں اِس تفصیل کی گنجائش نہ تھی۔

مرہٹوں کا فتنہ

ابھی یہ ساری بلائیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ چرخِ فتنہ انگیز نے ایک نیا ہنگامہ برپا کر دیا۔ عجب افراتفری پھیل گئی، یعنی جنگو نامی سردار بھاری فوج لے کر دکن سے آیا اور (اُس کا) لشکر شہر (دلّی) کے اطراف

---

[1] ۲۸ مارچ ۱۷۵۶ء۔ اس کا مفصل تذکرہ ہم نے گزشتہ صفحات کے حاشیے میں لکھ دیا ہے۔

میں خیمہ زن ہوا۔ بہتوں کے دل دہل گئے، ایک ہلڑ مچ گیا۔ امیروں کی سٹی گم ہوگئی۔ بادشاہ اور وزیر نے اُس سے صلح کرلی۔ دتا نامی سردار کو جو اس بہادر اور جیالے جوان (جنگجو) کا مدار المہام تھا، نجیب الدولہ کی طرف بھیج دیا، جو گنگا کے کنارے وسطی علاقے میں قدم جمائے بیٹھا تھا۔ وہاں گھمسان کی جنگ ہوئی۔

(اب) یہاں سب نے وزیر کے ہاں جمع ہوکر مشورہ کیا کہ اگر یہ بھاری سپاہ واپسی میں ہم پر ٹوٹ پڑی تو ایسی تباہی مچائے گی کہ عالم تہ و بالا کر دے گی اور سارا شہر غارت ہو جائے گا۔ بن پڑے تو اِن سے مل کر نجیب الدولہ کا کام تمام کردیں ورنہ درمیان میں پڑ کر صلح کرادیں۔

عالمگیر ثانی اور انتظام الدولہ کا قتل

یہ طے ہو گیا تو وزیر نکلا اور دریا (جمنا) کے پار خیمے گاڑ دیے، پھر بادشاہ کو شریک ہونے کی دعوت دی۔ اُس نے بیماری کے بہانے صاف انکار کر دیا۔ چوں کہ لوگوں کو بادشاہ کی طرف سے اطمینان نہیں تھا، مشورہ کیا کہ شہر جاکر بادشاہ کو ختم کردیں اور انتظام الدولہ کو بھی جیتا نہ چھوڑیں۔ راجا دتا گرمل، اسی رات دریا کے پار گیا، صبح ہوتے یہ سیاہ باطن، لشکر سے نکل کر شہر آئے اور بادشاہ کے سامنے قسمیں کھائیں کہ ہم وزیر سے خوش نہیں ہیں لیکن زمانہ سازی کر رہے ہیں۔ اگر حضور فائدہ اُٹھائیں تو ایک نادر موقع ہاتھ آیا ہے، وہ سادہ لوح (بادشاہ) اِن بد باطنوں کے فریب میں آگیا، پوچھا: "وہ کیا ہے؟" انھوں نے کہا: "ایک پہنچا ہوا فقیر جو تارکِ دنیا ہے، دو تین روز سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں وارد ہے، کل چلا جائے گا، اگر آپ شام کو اُس سے مل لیں تو غالب ہے کہ اُس خدا رسیدہ

بزرگ کی دعا سے ہم اِن آفتوں سے محفوظ ہو جائیں اور وزیر پر غلبہ پا لیں"۔ بادشاہ ان نمک حراموں کی منافقت سے بے خبر تھا۔ وعدہ کر لیا کہ "ہم ضرور ملیں گے"۔ آخر شام کے قریب اُسے سوار کر کے لے گئے، جب کوٹلے میں پہنچے تو اُس بے گناہ کے چاقو مار کر ہلاک کر دیا[1]۔ اور اُس کی نعش دیوار کے نیچے پھینک دی۔ شام کے بعد وہاں سے پلٹ کر خان[2] خاناں کے گلے میں پھندا ڈالا، جب کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا، اُسے بڑی بے رحمی سے ہلاک کر دیا۔ اُس کے مُردے کو سب کی نگاہوں سے بچا کر لے گئے اور دریا میں ڈال دیا۔ بادشاہ کی نعش تمام دن کس مپرسی کی حالت میں زمین پر پڑی رہی، جو دیکھتا وہ اِس وحشیانہ فعل پر لعنت کرتا تھا۔ آخر اُس کے وارثوں نے جی کڑا کر کے اُس کی میت راتوں رات دفنا دی، اور اُن ظالموں کے خوف سے ماتم بھی نہیں کیا۔ دوسرے دن صبح وہ اشقیا قلعے میں آئے، اور شاہ جہاں نامی ایک جوان کو تخت پر بٹھا کر نذریں پیش کیں۔ عالمگیر ثانی کی سلطنت

---

[1] عزیز الدین شاہ عالمگیر ثانی ابن جہاں دار شاہ ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوا، ۲ جون ۱۷۵۴ء (۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ) کو تخت نشین ہوا۔ اور ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء (۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ) کو عماد الملک نمک حرام کی غداری اور مہدی علی خاں کی سازش سے قتل ہوا۔ ہمایوں کے مقبرے میں مدفون ہے۔

[2] انتظام الدولہ خان خاناں، نواب قمر الدین خاں کا دوسرا بیٹا تھا، ۱۷۴۸ء / ۱۱۶۱ھ میں بزمانہ احمد شاہ بخشی دوم ہوا، اور ۱۷۵۳ء / ۱۱۶۵ھ میں صفدر جنگ کی معزولی کے بعد وزیر بنا۔ ۳۰ نومبر (۱۷۵۹ء) کو بادشاہ کے قتل سے اگلے دن عماد الملک کے آدمیوں نے اُسے بھی مار ڈالا۔

کا زمانہ سات سال رہا۔

جب اِن ظالموں نے بادشاہ اور انتظام الدولہ کے قتل سے فراغت پائی تو وزیر کو لے کر کوچ کیا اور بھاگم بھاگ راستہ طے کر کے مرہٹوں کی فوج سے مل گئے اور جنگ میں اُن کے شریک بن گئے۔ ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ خبر آئی شاہی فوج (ابدالیوں) نے اٹک پار کر کے صاحبا کو شکست دے دی۔ مرہٹے نجیب الدولہ کی جنگ یوہیں اُدھڑ میں چھوڑ کر (ابدالی) فوج کو روکنے کے لیے بدحواس ہو کر بھاگے۔ اور پانی پت کے قریب دریائے جمن عبور کر کے اُترے۔ راستے میں ایک عالم پر مصائب توڑتے اور تاخت و تاراج کرتے ہوئے کرنال کے اُس طرف خیمہ زن ہوئے جو ایک مشہور قصبہ ہے اور وہاں (حضرت) شاہ شرف بو علی قلندر کا آستانہ ہے۔ شام کو سُنا گیا کہ شاہی فوج دریا کی سمت پہنچ چکی ہے، انھوں نے بھی اپنی فوج کو آگے بڑھایا۔ دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے تقریباً آٹھ ہزار جیالے سوار ایک سردار کی سرکردگی میں بھیجے۔ وہ شاہی فوج سے مقابل ہوئے مگر ایک ہی دھاوے میں بہتوں کے پانو اُکھڑ گئے۔ بڑے بڑے سورماؤں کا گھمنڈ نکل گیا۔ جو بہت دؤن کی لیتے تھے، اوندھے ہو گئے۔ اُدھر کے خوں خواروں نے ایسا ہلا بولا کہ آن کی آن میں کشتوں کے پُشتے لگا دیے۔ اِدھر کی فوج کے چھکے چھوٹ گئے، جوانوں کے دل ہل گئے۔ اگر خدا نخواستہ وہ حصار پر ٹوٹ پڑتے تو آفت مچ جاتی اور ہم لوگوں میں ایک بھی شہر میں زندہ نہ بچتا۔ یہ لوگ تو ہار کر واپس آ گئے اور وہ (دُرّانی) مالِ غنیمت لوٹ کر دریا کے پار اُتر گئے۔

جب بادشاہ نے دو آبے میں ڈیرے ڈالے اور نجیب الدولہ اُن سے آکر مل گیا تو دکنی سرداروں نے لشکر اور شہر کی محافظت کے لیے وزیر کو دستوری مرحمت کر دی اور خود وہاں سے نکل کر چھ کوس اُدھر خیمے گاڑ دیے۔ یہاں وزیر نے شہر کو محکم کر کے چوکیاں بٹھا دیں اور دارا شکوہ کی حویلی جو دریا کے کنارے واقع ہے، راجا کو سونپ کر نئے بادشاہ، شاہ جہاں (ثانی) کی خدمت میں آگیا۔

چار روز کے بعد بادشاہ (ابدالی) اور نجیب الدولہ کی فوجیں کوچ پر کوچ کرتی ہوئی دریا پر پہنچ گئیں، اور اُس کی جنگ جُو فوج (مرہٹوں کی) گوش مالی کرنے پر متوجہ ہوئی۔ روہیلہ فوج کے پیادوں نے پیش قدمی کر کے جنگ شروع کر دی۔ اور خوب کٹ کٹ کے لڑے۔ اِدھر سے دتا جو مرہٹہ فوج کا سردار تھا اپنی فوج سے آملا اور جی جان سے لڑا۔ اُدھر سے پہلا ہی حملہ ہوا تو ایک تیر دتا کے پہلو میں بہت کاری لگا۔ مرہٹوں کے ہاتھ پانو پھُول گئے، وہ دتا کے مُردے کو دریا کے پار لے گئے۔ اُنھوں نے بھی دریا کے پار اُتر کر مار دھاڑ شروع کی اور یہ (مرہٹے) بھاگنے لگے۔ وزیر اپنے سرداروں کو چوکیوں پر چھوڑ کر مرہٹوں کی فوج سے آملا۔ اب زمانۂ غدار نے یہ تباہی مچائی کہ دُرانیوں نے (مرہٹوں کی) بھگوڑی فوج کا تعاقب کیا اور اُن میں سے اکثروں کو قتل کر دیا وہاں سے واپس آکر شہر لوٹنے میں لگ گئے۔

دلّی میں لوٹ شام کو راجا شہر سے سورج مل کے قلعوں میں جانے کے لیے نکلا۔ ہارے یہ صحیح سلامت پہنچ گیا۔ بندہ (میر) اپنی عزت تھامے شہر میں بیٹھا رہا۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ "بادشاہ نے امان دے دی ہے رعایا کو چاہیے کہ پریشان نہ ہو۔" مگر جب گھڑی بھر رات گزری تو غارت گروں نے ظلم و ستم

ڈھانا شروع کیے، شہر کو آگ لگا دی، گھروں کو جلا دیا اور (سارا ساز و سامان) لے گئے۔ صبح کو جو (گویا) صبح قیامت تھی تمام شاہی (درانی) فوج اور روہیلے ٹوٹ پڑے اور قتل و غارت میں لگ گئے۔ (شہر کے) دروازوں کو توڑ ڈالا اور لوگوں کو قید کر لیا بہتوں کو جلا دیا اور سر کاٹ لیے۔ ایک عالم پر یہ مظالم توڑے اور تین دن رات تک (اس) ظلم سے ہاتھ نہ کھینچا۔ کھانے اور پہننے کی چیزوں میں سے کچھ نہ چھوڑا، چھتیں توڑ دیں، دیواریں ڈھا دیں (ان مصیبتوں سے کتنوں ہی کے) سینے زخمی اور کلیجے چھلنی کر دیے! وہ فتنہ گر ہر طرف چھائے ہوئے تھے اور شرفا کی مٹی پلید ہو رہی تھی۔ شہر کے عمائد خستہ حال ہو گئے، بڑے بڑے امیر ایک گھونٹ پانی کے لیے بھی محتاج بن گئے۔ گوشہ نشین بے گھر اور نواب گداگر بن گئے۔ شرفا ننگے تھے گھر والے ننگے۔ ہر ایک بلا میں گرفتار اور رسوائے کوچہ و بازار تھا۔ اکثر لوگ مصیبت میں مبتلا، اور ان کے زن و فرزند اسیر، شہر میں (غارت گروں کا) ہجوم تھا اور بے روک ٹوک قتل و غارت ہو رہی تھی۔ لوگوں کا حال ابتر ہو گیا۔ بہتوں کی جان لبوں تک آ گئی۔ (یہ غارت گر) زخم بھی لگاتے اور گالیاں گفتاریاں بھی دیتے۔ روپیہ بھی سب چھین لیتے، اور مار الگ لگاتے۔ جو سامنے آجاتا اُس کے بدن کے کپڑے تک نہ چھوڑتے۔ ایک عالم تکلیفیں جھیل کر مر گیا۔ ایک جہاں کی عزت و ناموس برباد ہو گئی۔ نیا شہر جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ تیسرے دن انتظام سنبھلا۔ انزلا خاں نامی پہنچی آیا تو رہا سہا اُس نے لوٹ لیا۔ بارے منتظمین نے لوٹ مچانے والوں کو شہر سے نکال کر احتیاطی تدابیر شروع کیں (اب) وہ بے رحم لوگ پرانے شہر کے تاراج کرنے میں لگ گئے، (وہاں) بے شمار انسانوں کو قتل کر دیا سات آٹھ دن تک یہ ہنگامہ رہا۔ ایک

وقت کے کھانے اور ستر ڈھکنے کے وسائل بھی کسی کے گھر میں نہ رہے، مردوں کے سر ننگے تھے اور عورتوں کے پاس اوڑھنی بھی نہ تھی۔ چوں کہ راستے بند تھے بہت لوگ زخم کھا کھا کر مر گئے، کچھ سردی کی شدت سے اکڑ گئے۔ (اس فوج نے) بڑی بے حیائی سے لوٹ مچائی اور (شہریوں کو) بے آبرو کیا، غلہ زبردستی چھینتے اور مفلسوں کے ہاتھ دھونس سے فروخت کرتے، اِن غارت گروں کا شور و ہنگامہ سا تویں آسمان تک پہنچ رہا تھا، مگر بادشاہ جو خود کو فقیر سمجھتا تھا، استغراق کے باعث سُنتا ہی نہ تھا۔ ہزاروں خانہ خراب اِس ہنگامے سے نکل کر بصد حسرت ترکِ وطن کر گئے اور جنگل کی طرف منھ اُٹھا کر چل دیے۔ مگر راستے ہی میں مر گئے۔ بہت سے مجبوروں کو وہ ظالم قید کر کے اپنے لشکر میں لے گئے۔ چوں کہ اِن جفاکاروں کی بن آئی تھی۔ لوٹتے کھسوٹتے، ایذائیں دیتے، ستم ڈھاتے، عورتوں کی بے حرمتی کرتے، اپنی تلواریں لیے مال بٹورتے پھرتے۔ شہریوں سے کچھ نہ ہو سکتا تھا کیوں کہ اُن میں قوتِ مدافعت نہیں تھی۔ کوئی سراسیمہ و مضطرب تھا، کوئی حسرت اور افسوس کرتا تھا، ہر گھر میں، ہر گلی کوچے میں، ہر بازار میں یہ غارت گر تھے اور اِن کی دار و گیر۔ ہر طرف خوں ریزی، ہر سمت ظلم و ستم۔ ایذا بھی دیتے اور طمانچے (بھی) مارتے۔ غریب لوگ خوف سے سہمے جاتے اور یہ لٹیرے ملندریاں مارتے پھر رہے تھے۔ گھر جل گئے، محلے ویران ہو گئے۔ سینکڑوں لوگ ان سختیوں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ اور کسی کی فریاد سُننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک عالم اُن کے ستم سے ہلاک ہو گیا، مگر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ پرانے شہر کا علاقہ جسے (رونق و شادابی کے باعث) "جہانِ تازہ" کہتے تھے۔ کسی گری ہوئی منقش دیوار کی مانند تھا یعنی جہاں تک نظر

جاتی تھی، مقتولوں کے سر، ہاتھ، پاؤں، اور سینے ہی نظر آتے تھے۔ ان مظلوموں کے گھر ایسے جل رہے تھے کہ آتش کدے کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ یعنی جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی، خاکِ سیاہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جو مظلوم مر گیا (وہ گویا) آرام پا گیا، (اور) جو اُن کی زد میں آگیا بچ کے نہ جا سکا۔ میں کہ (پہلے ہی) فقیر تھا، اب اور زیادہ مفلس ہو گیا۔ افلاس اور تہی دستی سے حال بہت ابتر ہو گیا۔ سڑک کے کنارے جو مکان رکھتا تھا وہ بھی ڈھو کر برابر ہو گیا۔ غرض کہ وہ ظالم سارے شہر کا اسباب لاد کر لے گئے اور شہر کے لوگ بڑی ذلت و رسوائی اُٹھا کر جان سے گزر گئے۔

مرہٹے پھر آپہنچے ابھی انھوں نے لوٹ مار بند بھی نہ کی تھی جو یہ مشہور ہوا کہ مرہٹوں کی فوج جو ہار کر بھاگی تھی، اُس لشکر کے ساتھ جو میوات کے علاقے میں تھا مل گئی ہے اور اُن کے ارادے ناپاک ہیں[1]۔ شاہ

---

[1] اس پُر آشوب زمانے میں سلطنتِ مغلیہ کے چپے چپے پر سازشیں اور بغاوتیں ہو رہی تھیں ایک معمولی سردار بھی ہندستان پر بادشاہت کرنے کے خواب دیکھتا تھا، خود قلعہ شاہی کے امرا نے بادشاہ کو کٹھ پتلی بنا رکھا تھا اور آئے دن اکھاڑ پچھاڑ میں مصروف رہتے تھے۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی تھی، بھرت پور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں جاٹ سر اٹھا رہے تھے، اودھ میں روہیلے اپنی مضبوط ریاست بنا چکے تھے مگر ان سب سے زیادہ طاقت مرہٹوں نے حاصل کر لی تھی جو اُس وقت برار سے سندھ تک پھیلے ہوئے تھے۔ عماد الملک اپنا اقتدار قایم رکھنے کے لیے مرہٹوں کا دست نگر تھا اور اس نے سلطنت دہلی کے کاموں میں رفتہ رفتہ مرہٹوں کو دخیل کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نجیب الدولہ کے استیصال کی فکر میں لگا ہوا تھا، جسے ابدالی اپنا مختار بنا کر قلعہ دہلی میں چھوڑ گیا تھا (باقی)

(ابدالی) نے یہ خبر سن کر اُن کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ شاہ جہاں (ثانی) کو جو چند مہینے کی برائے نام سلطنت کا گنہ گار تھا، پہلے کی طرح سلاطین میں بھیج دیا، اور

(گزشتہ صفحہ سے) چناں چہ اس نے ستمبر (۱۷۵۷ء) میں نجیب الدولہ کو دہلی سے نکال دیا، اور دتا سیندھیا کو سوا لاکھ فوج کے ساتھ اُس پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ نجیب الدولہ نے ایک طرف تو شجاع الدولہ، حافظ رحمت خاں اور احمد خاں بنگش وغیرہ سے کمک طلب کی تاکہ اپنی ریاست کو محفوظ کرسکے اور دوسری طرف ابدالی کو لکھ بھیجا کہ مرہٹے اسلامی سلطنت کا نام ونشان مٹانے پر تُلے ہوئے ہیں اس وقت آپ کی مدد کی شدید ضرورت ہے۔ مرہٹوں نے ایک ہی دن میں ایک ہزار تین سو گانو جلا کر خاکستر کر دیے۔ اور سکرتال (مظفر نگر) میں آکر صف بند ہو گئے۔ دہلی سے عالمگیر ثانی نے بھی ابدالی کو خط لکھا تھا کہ عماد الملک میرے خاندان کو اور مجھے قتل کرنے کی سازشیں کر رہا ہے۔ مگر ابدالی اُن دنوں خود اپنی سلطنت میں اندرونی شورشوں کے فرو کرنے میں لگا ہوا تھا اس نے یہی جواب دیا کہ میں یہاں کے کچھ سرکشوں کو کیفر کردار تک پہنچا دوں پھر آپ کی مدد کے لیے بھی آتا ہوں۔ آخر وہ اکتوبر ۱۷۵۹ء میں لاہور پہنچ گیا اور مرہٹوں کو وہاں سے بھگا کر اپنے وزیر شاہ ولی خاں کے بھانجے کریم داد خاں کو گورنر مقرر کیا۔ ۲۷ نومبر (۱۷۵۹ء) کو سرہند اور وہاں سے سیدھا دلی آیا۔ عماد الملک کو اس کے آنے کی خبر ملی تو اس نے عالمگیر ثانی کو (۲۹ نومبر) اور انتظام الدولہ خان خاناں وزیر (۳۰ نومبر) کو قتل کرا دیا اور پھر سورج مل کے قلعوں میں جا بیٹھا۔

ادھر دتا سیندھیا نجیب الدولہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، اس نے ۲۰ دسمبر کو جمنا عبور کی، اس وقت ابدالی انبالے میں تھا، وہ قریب آیا تو تاراوری کے مقام پر دونوں فوجوں میں شدید مقابلہ ہوا (۲۴ دسمبر) اور چار سو مرہٹے مارے گئے۔ دتا بھاگ گیا۔ ابدالی کی فوج جمنا پار کر کے نجیب الدولہ سے آملی، حافظ رحمت خاں، عنایت خاں، دوندے خاں، سعد اللہ خاں وغیرہ سردارانِ مشرق بھی ابدالی فوج کے شریک ہوئے اور ۹ جنوری (۱۷۶۰ء) (باقی)

عالی گہر کے لڑکے جواں بخت کو اُس کا ولی عہد مقرر کر کے شہر سے کوچ کر گیا۔ عماد الملک مرہٹہ سرداروں کے ہمراہیوں کو چھوڑ کر سورج مل کے قلعوں میں آ گیا۔ جب شاہ

(بقیہ) کو جمنا پار کر کے براری گھاٹ کے قریب مرہٹوں کو پھر گھیر لیا۔ اس میں دتا سیندھیا مارا گیا اور اس کا بھانجا جھنکوجی سخت زخمی ہوا۔ ادھر ملہار راؤ ہلکر کچھ اور فوج لے کر آ گیا اور دتا کی بھاگی ہوئی فوج راجپوتانے میں جا کر اُس سے مل گئی اور بالا ہی بالا روہیل کھنڈ کی طرف حملہ آور ہوئی۔ ۲۶ جنوری (۱۷۶۰ء) کو یہ فوجیں جمنا کے پار اُتریں اور چاہتی تھیں، کہ نجیب الدولہ کا دس لاکھ روپیہ جو آ رہا تھا راستے ہی میں لوٹ لیں، مگر جہاں خاں نے بروقت مدد کی اور مرہٹوں کو سکندرہ کے قریب شکست دے کر خزانہ بچا لیا (۴ مارچ) سخت گرمی اور برسات کے باعث ابدالی علی گڑھ کے قریب ٹھیر گیا اور نجیب الدولہ کو اپنی جانب سے شجاع الدولہ پر چڑھا کر بھیج دیا۔ شجاع الدولہ ۳۰ ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ فوج لے کر ابدالی سے آ ملا۔ دتا اور ملہار کی شکست سے پیشوا نا اُمید نہیں ہوا، اب کی بار اس نے اپنے بیٹے اور جانشیں وشواس راؤ کی سرکردگی میں بھاری سپاہ بھیجی۔ جس میں توپ خانے کا نگراں ابراہیم خاں گردی تھا جو مشہور ماہر جنگ بوسی (BUSSY) کا تربیت یافتہ تھا۔ سداشیو بھاؤ بھی فوج کا سربراہ تھا۔ ۱۳ جنوری ۱۷۶۱ء کو ہندستان کی وہ عظیم جنگ ہوئی جسے تاریخ میں "تیسری جنگ پانی پت" کہا جاتا ہے۔ اور جو مہا بھارت یدھ کے بعد سب سے بڑی اور فیصلہ کن جنگ تھی۔ اس کا حال میر نے خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں تیس ہزار سے زائد مرہٹے ہلاک ہوئے۔ ۲۲ ہزار کے قریب گرفتار کیے گئے۔ اور بے شمار زخمی ہو گئے۔ دو لاکھ مویشی ہاتھ لگے، جن میں پانچ سو ہاتھی تھے۔ زر و جواہر کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ۲۹ جنوری (۱۷۶۱ء) کو احمد شاہ دلی آ گیا اور ممتاز محل میں مقیم ہوا۔ ابدالی فوجوں نے دلی کو پھر لوٹ کر برابر کر دیا۔ ۲۲ مارچ (۱۷۶۱ء) کو ابدالی مع افواج کے افغانستان چلا گیا۔ ہندوستان پر ابدالی کا یہ پانچواں حملہ تھا۔ (مترجم)

(ابدالی) میوات کے قرب و جوار میں پہنچا اور مرہٹوں نے دیکھا کہ ہمارا حملہ کارگر نہیں ہوتا اور فوج سہم گئی ہے، تو وہ اپنے قدیم معمول کے مطابق بھگدڑ مچاتے ہوئے شاہ جہاں آباد (دلّی) تک آ گئے اور دریا عبور کر لیا۔ شاہ نے بھی اُن کا تعاقب کیا اور رات شہر کے قریب بسر کر کے (صبح کو دریا کے) پار اُتر گیا، جو پایاب تھا۔ جب دریا کے اُس طرف لشکر جما لیا تو اس کی فوج کا سردار جہاں خاں آگے بڑھا اور سکندر آباد کے قریب ملہار کی فوجوں سے، جس کا حال آگے لکھا جا چکا ہے، بھڑ گیا۔ شاہ (ابدالی) بھی یہاں سے تین ہزار لشکریوں کو لے کر دو گھڑی میں اس سے جا ملا۔ اُدھر کے سردار (ملہار) میں مقابلے کی ہمت نہ رہی تو وہ اپنی جگہ مرہٹہ سرداروں میں سے ایک کو سونپ کر خود چپکے سے بھاگ گیا۔ اُس (مرہٹہ) سردار نے بہادری کے جوہر دکھائے اور (لڑتے لڑتے) مارا گیا۔ اُس کے سپاہی پسپا ہو کر (ابدالی) کے لشکرِ جرّار کے مقابلے سے بھاگ پڑے اور منتشر ہو گئے۔ شاہ (ابدالی) کول تک جو ایک مشہور قصبہ ہے، اُن کے تعاقب میں گیا۔ اِن بھگوڑوں نے سورج مل کے قلعوں میں پناہ لی اور دو تین دن کے بعد آگے روانہ ہو گئے۔ شاہی فوج اُس کے قلعوں میں سے ایک قلعے پر جو دریائے جمن کی دوسری جانب تھا، دھرنا دے بیٹھی اور محاصرہ کر کے لوگوں کا ناک میں دم کر دیا۔ زمیندار مذکور (سورج مل) نے اُن کی مدد کرنے میں اپنا کوئی فائدہ نہ دیکھا تو وہ بھی طرح دے گیا۔ مجبور ہو کر محصورین نے اپنا سفیر بھیج کر صلح کر لی اور قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

(سانحہ) ابھی یہ فوج دوآب ہی میں تھی جو یہ خبر پھیل گئی کہ (مرہٹوں کی)

بڑی بھاری فوج جنگ کرنے کے ارادے سے دکن سے آئی ہے، اور آگرے تک پہنچ گئی ہے۔ بس یہاں تک آیا ہی چاہتی ہے۔ نجیب الدولہ نے پورب کے سرداروں مثل شجاع الدولہ، واحمد خاں (بنگش) وحافظ رحمت خاں (روہیلہ) وغیرہ کو اپنے ساتھ ملالیا اور سب کو مُلک (میں حصہ) دینے کا لالچ دے کر خلعت دی، اور (مرہٹوں سے) جنگ کرنے پر آمادہ کرلیا۔

اِنھیں دنوں، بھاؤ جو مرہٹوں کا بڑا سردار تھا اپنے بھاری لاؤ لشکر کے ساتھ سورج مل کے علاقے سے گزرا۔ وزیر اور راجا اُسے بہلا پھسلا کر ساتھ لے آئے اور شہر پر قبضہ کرلیا۔ یعقوب علی خاں، جو شاہ درانی کے وزیر شاہ ولی خاں سے قرابت بھی رکھتا تھا (اور اُن دنوں دلی میں شاہی قلعہ دار تھا) یہ سوچ کر کہ شاہی فوج دریا کے اُس طرف موجود ہے اور وہ مدد میں دریغ نہ کرے گی، (مرہٹوں سے) مصروفِ جنگ ہوگیا۔ دکنی فوج نے قلعے کا محاصرہ کرکے اُسے فتح کرلیا۔ اور اکثر مکانات شاہی کو جو خوبصورتی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، خاک میں ملا دیا۔ چوں کہ دریا کا (برسات کے باعث) پار کرنا مشکل تھا، اور شاہ (ابدالی) وہاں سے گزر نہیں سکتا تھا۔ خاں مذکور (یعقوب علی خاں) نے راجا سے صلح کرلی اور قلعے سے نکل آیا۔ معاہدے کی رو سے کسی نے اس سے روک ٹوک نہ کی۔

دلی سے میرا کوچ

میں اُن دنوں راجا کی خدمت حاضر ہوا اور عرض کی کہ زمانے کے ہاتھوں سخت پریشان ہوں چاہتا ہوں کہ شہر سے نکل جاؤں اور جہاں سینگ سمائیں چلا جاؤں، ممکن ہے اسی طرح کچھ آسودگی نصیب ہو جائے۔ اُنھوں نے میرے ساتھ رعایت کی اور مجھے رخصت کر دیا۔

میں بال بچّوں کو لے کر (پیادہ پا) نکلا، کوئی منزل تو تھی نہیں، خدا پر بھروسا کر کے راستہ طے کرنا شروع کیا۔ دن بھر میں بڑی مشکل سے ۸ - ۹ کوس کی منزل ہو سکی۔ رات ایک سرائے میں درخت کے نیچے گزاری۔ اگلی صبح کو راجا جگل کشور کی، جس کا حال لکھا جا چکا، بیوی، اُدھر سے گزریں اور ہم مجبوروں کی دستگیری کی۔ اپنے ساتھ "رسانہ" تک جو ہندوؤں کا تیرتھ اور سورج مل کے قلعوں سے آٹھ کوس اِدھر ایک قصبہ ہے، لے آئیں اور طرح طرح کے سلوک کر کے دل جوئی کی۔

کاماں جانا

ذی الحج کی آخری تاریخ کو وہ کاماں گئیں جو اُس جگہ (رسانہ) سے تین کوس پر راجا جے سنگھ (والیٔ جے پور) کی سرحد ہے۔ فقیر (میرؔ) اپنے اہل و عیال کے ساتھ عشرۂ (محرم) میں وہیں مقیم رہا اور عاشورے سے اگلے دن (۱۱ محرم) وہاں سے نکل کر کمھیر پہنچا۔

کمھیر میں قیام

یہاں صفدر جنگ کے سابق خزانچی لالہ رادھا کشن کا بیٹا بہادر سنگھ جو ان دنوں راجا کے ساتھ (مقیم) تھا، (ایک) شام کو آیا۔ مجھے اپنے ساتھ لے گیا، اور میری امداد و اعانت کی۔ میں اُس کا احسان مند ہوں کہ اس نے دوستی کا حق ادا کیا اور کچھ دن سُکھ چین سے بسر ہو گئے۔

(حکایت) میں ایک دن کھانے پینے کا سامان نہ ہونے کے باعث پریشان بیٹھا تھا۔ جی میں آئی کہ اعظم خاں کلاں جو فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے عہد میں شش ہزاری امیر، اور نہایت کریم النفس انسان تھا، کے لڑکے اعظم خاں سے ملا جائے تو شاید (وہ امداد کرے اور) کچھ دن سُکھ سے گزر جائیں۔ (چناں چہ) گیا، اور سورج مل کے طویلے میں اُس سے ملا جو دہلی کے خانہ خرابوں کی نئی جائے پناہ

بنا ہوا تھا۔ اُس عزیز نے خدا بخشے، میری خیر و عافیت معلوم کی۔ میں نے اپنا دُکھڑا سنایا، (تو) سُننے والے بہت متاثر ہوئے۔ جب قہوہ اور حقّہ لایا گیا، تو یہ شعر (میری) زبان پر آیا ؎

امروز چو کارِ من د عُرفی بہم اُفتاد
باہم نگرستیم دگرستیم دگوشتیم [1]

ایسے ہی چند شعر میں نے پڑھے، اور دو تین آنسو پلکوں سے گرائے۔ چند لمحوں کے بعد دیکھا کہ خان فکرمند ہے، میں نے کہا "آپ کس سوچ میں پڑ گئے" بولا: "کچھ نہیں" میں نے کہا: "کچھ تو ہے!" کہنے لگا: "جب تم شہر (دہلی) میں آتے تھے تو ہم طرح طرح کی مٹھائیاں اور قسم قسم کے حلوے منگاتے اور دونوں کھاتے تھے۔ آج عجب اتفاق ہے کہ کچی کھانڈ بھی میسر نہیں جو تمھارے لیے ایک پیالہ شربت بنا سکوں۔" میں نے کہا: "میں ان سب چیزوں کا ندیدہ نہیں ہوں، وہ بات بھی تفریحاً ہو جاتی تھی، آپ تو جانتے ہیں کہ میں حریص اور لالچی نہیں۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے وہ شربت و شیرینی کا وقت تھا، یہ تلخیاں جھیلنے کا موسم ہے" یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ ایک عورت سر پر خوان رکھے دروازے سے داخل ہوئی اور بولی: "سعید الدین خاں خان ساماں کی بہن نے (آپ کو) دعا کہی ہے، کچھ "حلوائے نزاکت" اور "شنبے کی (نیاز کی) شیرینی بھیجی ہے۔ خان نے خوان پوش اٹھایا، اور اس کی نظر حلوے پر پڑی تو باغ باغ ہو گیا، کہنے لگا "یہ روسیاہ تو اپنی قدر خوب جانتا ہے، ایک

---

[1] (ترجمہ) آج (جب) میرا اور عرفی کا سامنا ہوا (تو) ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا، رُوئے اور چل دیے!

عمر سے فاقہ کشی پر مدار ہے حلوے اور شیرینی کا تو ذکر ہی کیا! کہیں سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہیں آیا۔ تم میرے عزیز مہمان ہو یہ سب تمھارا ہے۔ میرا حصّہ مجھے دے کر باقی سب اپنے گھر بھیج دو۔" میں نے کہا: "یہ تو بہت ہے' میں (اتنے سارے کا) کیا کروں گا۔" کہنے لگا: "تمھارے لڑکے میر فیض علی کے کام آئے گا۔" غرض کہ اس بھلے مانس نے اصرار کرکے حلوے کی قاب اور مٹھائی کا خوان میرے گھر بھجوا دیا اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کیا۔ دو دن تک اُسی مٹھائی پر گزر ہوئی۔ تیسرے دن راجا کے چھوٹے لڑکے (بشن سنگھ) نے مجھے بلایا اور حالات دریافت کرنے کے بعد کہا کہ "راجا صاحب کے آنے تک میرے پاس رہو۔" میں نے کہا: "کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں۔" بولا: "مطمئن رہو یہاں سب کچھ موجود ہے۔" باغِ کرم کے اُس گُلِ نودمیدہ نے 'خدا اُسے خوش رکھے' میری ضرورت کا سب سامان مہیا کر دیا۔

جنگ پانی پت ۱۷۶۱ء

(سانحہ) یہاں سُننے میں آیا کہ شہر (دلی) میں افواہ پھیلی ہے کہ سرہند کا فوج دار صمد خاں کچھ زمینداروں اور بھاری فوج کے ساتھ آ رہا ہے اور شاہی لشکر (سے مقابلہ کرنے) کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ دکھنی فوج کے سردار بھاؤ نے جو بڑا ہیکڑ جوان تھا اور اپنے آگے کسی کو نہ سمجھتا تھا' فالتو سامان قلعے میں چھوڑ چھاڑ اپنے مزاج کی تیزی کے اقتضا پر اُدھر بڑھنا شروع کیا۔ اُس کے دل میں یہ تھی کہ وزیر کے پاس کافی زر و جواہر ہیں اور سورج مل بڑا زمیندار ہے' اگر زمانہ مہلت دے تو وہ ان میں سے کچھ ہتھیالے گا۔ راجا ناگر مل کو اُس کے سرداروں کی ملاقات سے یہ بات معلوم

ہو چکی تھی۔ اُس نے ایک دن راجا کو پیغام بھیجا کہ میں ممالکِ محروسہ کا انتظام تمھارے لیے واگزار کرتا ہوں۔ اس عزیز نے اس پر غور کر کے جواب بھیجا کہ میں ایک مدت سے وزیر کے ساتھ ہوں، (اس لیے) یہ مناسب نہیں کہ وہ ناکام رہے اور میں اپنا اُلّو سیدھا کر لوں۔ مناسب یہ ہے کہ آپ اُسے بھرت پور کی دستوری مرحمت کریں؛ میں اور سورج مل بطور مشایعت جائیں اور اُسے دفع کر دیں۔ پھر کہنے کے موافق عمل کریں۔ غرض اُس نے خوب روغنِ قاز ملا۔ دکھنیوں کے کوچ کے دن، وہ خود اور سورج مل مذکورہ بہانے سے بڑے لشکر کے ساتھ سوار ہوئے اور بلّم گڈھ میں جو شہر سے بارہ کوس پر ایک مضبوط قلعہ ہے، آکر بیٹھ گئے۔ وزیر اس کا اسباب اور خیمے وغیرہ آگے (بھیج دیے) گئے۔ دکنی فوج کے لوگوں نے ہر چند منت سماجت کی۔ لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور بادشاہ سے مل گئے۔ دکھن کا سردار، جو بڑا جیالا تھا اور اپنے بھاری لاؤ لشکر، ساز و سامان اور ہتھیاروں کے آگے اِدھر کے مٹھی بھر سپاہیوں کو نظر میں نہ لاتا تھا، اُسے جب یہ حال معلوم ہوا تاؤ میں آگیا اور کہنے لگا: "اِن کی حیثیت ہی کیا ہے؟ ان کی حکومت کا چراغ ویسے ہی ٹمٹما رہا ہے، میں اِن کے بھروسے پر دکھن سے نہیں آیا ہوں، اِنھیں چشم زدن میں چٹکیوں سے مسل دوں گا۔" اِس حرکت کے تدارک کو اُس نے پھر کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھا اور نجابت خاں روہیلہ کے قلعے پر قبضہ کر کے صمد خاں کو مار ڈالا، اور اُس کی فوج کو بھگا دیا۔ اُس کی فوج کے پسپا ہو جانے سے مرہٹوں کی ہمت بندھ گئی (اب انھوں نے) وہاں سے پلٹ کر پانی پت کے قریب مورچے بنا لیے، اور بادشاہ کی فوج سے کھُلی جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ جب ذرا جون ندی کا پانی اُتر گیا

توشاہ (ابدالی) بڑے جوش خروش سے پورب کے سرداروں کے ساتھ دریا کے پار اُترا اور جنگ کرنے کے لیے آ ڈٹا۔ باقاعدہ جنگ چھڑنے سے چند روز پہلے یہ خبر ملی کہ گوبند پنڈت بڑی بھاری سپاہ کے ساتھ ہے اور مرہٹوں کی فوج سے ملنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ (ابدالی کی فوج کے) ایک سردار نے شاہی لشکر سے جدا ہو کر اُسے چپکے سے جا گھیرا اور ہلاک کر دیا۔ سارا سامان لوٹ کر اُس کے لشکر کو تتر بتر کر دیا۔

اسی دوران کمھیر میں جو سورج مل کا قلعہ ہے، راجا (ناگرمل) دوبارہ تشریف لائے، قسمت کی بات، میں اُن دنوں وہیں تھا، (ان کی خدمت میں) گیا اور التماس کیا کہ "میں آپ کی تشریف آوری کا منتظر تھا۔ اب مجھے اجازت دیجیے کہ کہیں نکل جاؤں، کیوں کہ ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی۔" راجا نے جو میرے حال پر بڑی عنایت فرماتے تھے کہا: "معلوم ہوتا ہے" بیابانِ مرگ" میں جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ ہاں اگر میں چھوڑ دوں (تو چلے جانا)"۔ اسی دن خرچ کے واسطے کچھ بھیجا اور میرا وظیفہ بدستور سابق دستخط کر کے عنایت کیا۔

اُس بزرگوار (راجا) نے تو یہیں سکونت اختیار کر لی، کیوں کہ اب شاہجہاں آباد ایک ویرانے سے زیادہ نہیں رہا۔ اور لوگ سال میں دو دو بار اُجڑتے ہیں۔ آخر کوئی کب تک خانہ بدوش رہے! یہ سرزمین نسبتاً گوشۂ عافیت تھی، یہاں کا رئیس بھی خوش حال تھا۔ ہم لوگوں نے بھی اُس کے سایۂ دیوار میں اپنا ٹھکانا کر لیا اور وہیں رہ پڑے۔

(سانحہ) دونوں لشکروں کی حقیقت (سنیے) کہ مرہٹے اگر اپنے قدیم

دستور کے مطابق جنگ گریز کرتے تو عین ممکن تھا کہ غالب آجاتے۔ وہ توپ خانے کو گھیر کر بیٹھ گئے اور شاہی فوج اِس فکر میں لگ گئی کہ رسد نہ آنے دے۔ جب (رسد نہ آنے سے) پریشانی بہت بڑھ گئی تو مرہٹہ فوج جنگ پر آمادہ ہوئی، اور اُس کے سردار مورچوں سے باہر آکر ڈٹ گئے۔ (ابدالی فوج کے) جگرداربھی انھیں شکست دینے کے لیے جی توڑ کوشش میں لگ گئے۔ بہادروں نے بڑی تنظیم کے ساتھ ہلّا بولا اور متحد ہو کر تیروں کی بوچھار شروع کر دی۔ آزمودہ کاروں نے بندوقیں سنبھال لیں اور دَنا دَن گولیاں برسائیں، کچھ مقابل فوج پر تلواریں سونت کر ٹوٹ پڑے، کُشتوں کے پُشتے لگا دیے۔ حریف کی فوج نے پیادہ ہو کر لڑنا شروع کیا مگر منھ کی کھائی۔ (اُن کے) جوانوں کے بڑے کاری زخم لگے، اور (بہت سے) ہلاک ہوگئے یہ جنگ آور، دونوں طرف سے پل پڑے اور تیر و تفنگ سے حملہ کرتے رہے۔ (اب) دکن کا سردار پامردی کے ساتھ میدان میں آیا اور اُس نے شاہی فوج کے بہت سے دستوں کو مار بھگایا۔ لیکن فتح تو شاہ کے لیے (مقدر ہو چکی) تھی، اِن کی کوششوں سے کچھ نہ ہوا، بہتیری بندوقیں چلاتے تھے، مگر اُدھر کے ایک آدمی پر اثر نہ کرتی تھی۔ اُن کی فوج کے بہت سے کار آمد سپاہی اِدھر کی تفنگ اندازی سے زخمی ہوگئے۔ چناں چہ پہلے ہی ہلّے میں ایک تیر وشواس راؤ کے لگا جو (مرہٹہ) ریاست کا ولی عہد تھا، وہ خاک و خون میں لوٹ گیا۔ کہتے ہیں کہ بھاؤ بڑا غیور جوان تھا اور وہ دادِ مردانگی دے رہا تھا جب اُس نے اپنی آنکھوں سے یہ سانحہ دیکھا تو کہنے لگا کہ اب دکھن جانے

کا منھ نہیں رہا، جان پر کھیل کر (ابدالی کی) فوج کے قلب پر حملہ کیا یعنی جان بوجھ کر اپنے تئیں موت کے منھ میں دھکیل دیا۔ ملھار وہاں سے دو تین ہزار سوار دل کو ساتھ لے کر بھاگا اور (باقی) تمام لشکر غارت ہو گیا۔ جو سردار زندہ بچ رہے تھے وہ گداگروں کے حال میں آوارہ پھرتے تھے، ہزاروں بھگوڑے سپاہیوں کے گھوڑے اور ہتھیار اطراف شہر کے زمینداروں کے قبضے میں آ گئے۔ کیا لکھوں کہ کیسا روزِ بد اس قوم کو دیکھنا پڑا۔ ہزاروں ننگے (سپاہی) روتے ہوئے جس راستے سے گزرتے تھے لوگوں کے لیے عبرت کا سامان نظر آتے تھے۔ گاؤں کے لوگ بھنے ہوئے چنے سب کو ایک ایک مٹھی تقسیم کرتے تھے۔ اور اُن کی تباہ حالی کا موازنہ اپنے حال سے کر کے خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ ایسی عبرت انجام شکست کسی کو کم ہی ہوئی ہو گی۔ بہت سے بھوک سے مر گئے اور بہتوں نے ٹھنڈی ہوا میں اکڑ کر جان دے دی۔ وہ فوج جسے یہ قلعے میں چھوڑ کر آئے تھے، شاہی فوج کی لوٹ مار کے خوف سے رات کے وقت بھاگ گئی۔ کروڑوں روپے کا ساز و سامان (احمد شاہ ابدالی) اور پورب کے سرداروں کے ہاتھ لگا جسے انھوں نے (آپس میں) تقسیم کر لیا۔ نقد و جنس کے سوا توپ خانہ اور دوسرا جنگی سامان ہاتھی، بیل، گھوڑے اور اونٹ شجاع الدولہ وغیرہ نے اپنے حصے میں لے لیے۔ درّانی (سپاہی) جو فقیر محض تھے مالا مال ہو گئے، ہر دہ باشی کو سو اونٹوں کا سامان ملا، اور ہر شخص کو دو خر دار۔ بڑی دولت ہاتھ لگ گئی، ہر شخص پھولا نہ سماتا تھا، شاہ (ابدالی) اِس شاندار فتح کے بعد، کہ ایسی فتح شاہانِ سلف میں سے بھی کسی کو میسر نہ آئی ہو گی، بڑے کرّ و فر کے ساتھ شہر

میں داخل ہوا اور اطراف کے سرداروں کے نام فرمان بھیجے کہ دربار میں حاضر ہو کر خدمت بجا لائیں۔ ایک تحریر راجا (ناگرمل) کے پاس بھی پہنچی۔ وہ یہ سوچ کر حاضر ہو گئے کہ شاہ (ابدالی) ہندستان کا بادشاہ ہو گیا ہے۔ اور اب وہ اِس زر خیز ملک سے واپس نہ جائے گا، ہمیں اُس کی ملازمت کر لینی چاہیے۔ نجیب الدولہ اُن کی پیشوائی کے لیے آیا۔ شاہ کی خدمت میں اُس کے وزیر شاہ ولی خاں کے ذریعے باریابی ہوئی۔ یہ ملاقات خوش گوار رہی (شاہ نے) اپنی مُہر حوالے کی اور نیابت وزارت کے عہدے پر سرفراز فرمایا۔ چناں چہ وہ امرائے عظام کی فلاح و رفاہ کا سبب ہوئے۔

شجاع الدولہ سے صفائی

وزیر نے ایک بار کہا کہ شجاع الدولہ کے باپ تم سے بہت اخلاص رکھتے تھے یہ شخص ابھی بچہ ہے سوائے گھمنڈ اور خود نمائی کے کچھ نہیں رکھتا اتنا نہیں سمجھتا کہ یہ بادشاہ ہے اور زرا سی بات کھٹک جائے تو سب تہ و بالا ایک کر کے رکھ دے گا، محتاط رہنا مناسب ہے، اس قسم کی خود نمائی سے تو اُسے نہایت چڑ ہے، رفاقت کا خیال کر کے کچھ نہیں کہتا لیکن اِس پر پھولنا نہیں چاہیے۔

بادشاہان و نکویاں دو گروہِ عجب اند
کہ نبودند و نباشند بفرمانِ کسے [1]

بہتر یہ ہے کہ تم اور نجیب الدولہ جا کر اُسے سمجھا دو، ورنہ کل کلاں کو کچھ بات

---

[1] (ترجمہ) بادشاہ اور نیکو کار یہ دو عجیب گروہ ہیں جو نہ کبھی کسی کے تابع فرمان رہے ہیں نہ رہیں!

ہوئی تو ہم ذمہ دار نہیں ۔ چناں چہ دونوں گئے اور اُسے معذرت خواہی کے لیے آمادہ کر کے لائے، اور وزیر سے معافی دلائی بارے یہ ملاقات خوش آیند رہی اور کدورت صفائی میں بدل گئی ۔ میں بھی اس سفر میں اُن (راجا) کے ساتھ تھا ۔

دلّی پھر لُٹی! (حکایت) میں ایک دن ٹہلتا ہوا شہر کے تازہ ویرانوں سے گزرا، ہر قدم پر روتا اور عبرت حاصل کرتا تھا، جوں جوں آگے بڑھا، حیرت بڑھتی گئی، مکانوں کو شناخت نہ کر سکا، آبادی کا پتا تھا نہ عمارتوں کے آثار ۔ نہ اُن کے مکینوں کی خبر! ؎

از ہر کہ سخن کردم، گفتند کہ ایں جا نیست

از ہر کہ نشاں جُستم، گفتند کہ پیدا نیست [1]

گھر کے گھر مسمار (تھے اور) دیواریں شکستہ، خانقاہیں صوفیوں سے خالی۔ خرابات رندوں سے ۔ یہاں سے وہاں تک ایک ویرانہ تھا لق ودق! ؎

ہر کجا افتادہ دیدم خشت در ویرانۂ

بود فردِ دفترِ احوالِ صاحب خانۂ! [2]

نہ وہ بازار (تھے) جن کا بیان کروں، نہ بازار کے وہ حسین لڑکے، (اب) حسن کہاں جسے تلاش کروں؟ وہ یارانِ عاشق مزاج کدھر گئے؟

---

[1] (ترجمہ) جس کے بارے میں (بھی) معلوم کیا، جواب ملا کہ یہاں نہیں ہے (اور) جس سے پتا نشان پوچھا یہی کہا گیا "کچھ خبر نہیں"۔

[2] میں نے (اس) ویرانے میں جو اینٹ بھی پڑی دیکھی گویا وہ کسی صاحبِ خانہ کے دفترِ احوال کی ایک مسودہ تھی۔

حسین جوان گزر گئے، پیرانِ پارسا چلے گئے (بڑے بڑے) محل خراب (ہوگئے) گلیاں ناپید (ہوگئیں اور ہر طرف) وحشت برس رہی تھی، اُنس ناپید (تھا) ایک استاد کی رباعی مجھے یاد آگئی ؎

افتاد گزارم چو بویرانۂ طوس
دیدم چندے نشستہ برجائے خروس
گفتم چہ خبرداری ازیں ویرانہ؟
گفتا خبرا نیست کہ افسوس افسوس! [1]

ناگاہ اُس محلّے میں آنکلا، جہاں میں رہتا تھا، جلسے کرتا تھا، شعر پڑھتا تھا، عاشقانہ زندگی گزارتا تھا، راتوں کو روتا، خوش قدوں سے عشق لڑاتا، اُن (کے حسن) کی تعریفیں کرتا۔ اور لمبی لمبی زلفوں والے (معشوقوں) کے ساتھ رہتا تھا، حسینوں کی پرستش کرتا اور ایک لمحے کے لیے بھی اُن سے جدائی ہوتی تو بے قرار ہوجاتا تھا۔ محفل سجاتا تھا، حسینوں کو بُلاتا تھا، اُن کی مہمانداری کرتا تھا (اور یوں) زندگی گزارتا تھا، اب کوئی ایسا مانوس چہرہ نظر نہ آیا جس سے دو باتیں کرلیتا، کوئی معقول انسان نہ پایا جس کے پاس جا بیٹھتا، اس وحشت انگیز گلی سے نکل کر ویران راستے پر آکھڑا ہوا، اور حیرت سے (تباہی کے چھوڑے ہوئے نشانات)

---

[1] (ترجمہ) جب میرا گزر طوس (شہر) کے ویرانے میں ہوا، میں نے ایک جگہ (ایک) پرندہ بیٹھا دیکھا، اُس سے پوچھا کہ اِس ویرانے کے بارے میں تجھے کیا معلوم ہے؟ (تو) کہنے لگا بس اتنی خبر ہے کہ افسوس! افسوس!!

دیکھتا رہا۔ بہت صدمہ اُٹھایا، اور یہ عہد کیا کہ اب اِدھر نہ آؤں گا اور جب تک رہوں، شہر کا قصد نہ کروں گا!

ابدالی کی واپسی

(سانحہ) جب یہ طے ہوا کہ شادی خاں، راجا کے ساتھ جا کر کچھ اور علاقے فتح کرے گا، تو شاہ (ابدالی) کی فوج نے جو مالِ غنیمت سے مالا مال ہو چکی تھی، قلعے کے دروازے پر جمع ہو کر ہنگامہ کیا اور کہا کہ ہم تو اپنے وطن جاتے ہیں، شاہ (یہاں رہنا) چاہے تو رہے، ہم ایک مدت سے بادشاہ کی مہم میں لگے ہوئے ہیں اور بیوی بچوں کی بھی خیر خبر نہیں لی۔ شاہ نے سوچا کہ غیر ملک میں بغیر فوج کے رہنا ممکن نہیں۔ (تو) مجبوراً اپنی راجدھانی قندھار کو واپس ہو جانے کا تہیہ کر لیا۔ وزیر کو جو اپنے خیمے آگے بجوا چکا تھا واپس بُلا لیا۔ اور یہاں کے سرداروں کے سامنے شرمندگی اُٹھائی۔ (اپنی روانگی سے) دو روز پہلے راجا اور شجاع الدولہ کو رخصت کیا۔ (پھر) شہزادہ جواں بخت کو شاہ عالم کا ولی عہد مقرر کر کے شہر کا انتظام نجیب الدولہ کے سپرد کیا اور (دلّی سے) چلے گئے۔ راستے میں زین خاں نامی ایک افغان کو جو اُنھیں کے قوم و قبیلے کا تھا سرہند کا صوبیدار بنایا، اور لاہور کی طرف بڑھے۔ چوں کہ اس قوم کا غرور حد سے تجاوز کر چکا تھا۔ غیرتِ خداوندی نے اُنھیں سکھوں کے ہاتھوں ذلیل کیا جو (پنجاب کے) نواح میں بے اصلوں، جولاہوں، نداقوں، بزازوں، دلالوں، بقالوں، نجاروں، قزاقوں، کسانوں، کم مایہ لوگوں، سفلوں، جنگلیوں، بازاریوں، کمینوں اور تہی دستوں کی ٹولی تھی۔ تقریباً چالیس پچاس ہزار (سکھوں) نے اِس لشکرِ جرار کا مقابلہ کیا۔ کبھی تو ایسے مقابل آتے کہ زخم پر زخم کھاتے مگر پیٹھ نہ دکھاتے، اور کبھی اِدھر اُدھر منتشر ہو کر سو دو سو (ابدالی)

سپاہیوں کو گھیر کر مارے جاتے اور سب کو تہِ تیغ کر دیتے، ہر روز صبح کو فتنہ اُٹھاتے ہر شام کو چاروں طرف سے ٹوٹ پڑتے (غرض اُنھوں نے ابدالی کے) لشکریوں کا ناک میں دم کر دیا، اُنھیں جان بچا کر بھاگنا دوبھر ہو گیا، کبھی ظاہر ہوتے اور لشکر پر ٹوٹ پڑتے، کبھی شہر پر ہلّا بول دیتے اور اُسے تاراج کر دیتے۔ پریشان بالوں اور بندھے ہوئے چُٹلوں کے ساتھ فوج میں آتے تھے۔ رات بھر شور و شر (رہتا) اور سارا دن فریاد و فغاں (کی ہولناک آوازیں آتیں) اُن کے پیادے (ابدالی) سوار کے تلوار لگاتے اور اُن کے گھوڑے کی زین خون میں لت پت ہو جاتی، اُن کے معمولی سپاہی (ابدالی کے) تیر اندازوں کو پکڑے جاتے اور طرح طرح کی ایذائیں دیتے۔ غرض اُن فرومایوں نے اِن بے حقیقتوں کو ایسا ذلیل و رسوا کیا کہ اطراف کے جن سرداروں نے یہ سنا اُن کی نظروں میں کچھ وقعت نہ رہی۔ (دُرّانیوں میں) جم کر لڑنے کی سکت ہی نہ رہی، جان بچا کر نکل بھاگنے کو بہت غنیمت جانا اور وہاں کی نظامت کا خلعت ایک ہندو کو دے کر اپنا رستہ لیا۔ (سکھوں کی فوج کا) یہ انبوہ اُن کے تعاقب میں لوٹ کھسوٹ اور تخت و تاراج کرتا ہوا، دریائے اٹک تک گیا اور (ابدالیوں کی) اچھی طرح تنبیہ و گوش مالی کر کے اُس صوبے پر قبضہ کر لیا جس کی آمدنی دو کروڑ (سالانہ) تھی۔ کچھ دنوں کے بعد اُس شامت کے مارے ہندو کو، جو شہر (لاہور) میں مقیم تھا، قتل کر کے (بالکل ہی) مالک ہو گئے۔ اب چوں کہ ملک کا دعوے دار کوئی نہ تھا اُن کم اصلوں نے ملک کو آپس میں بانٹ لیا اور رعایا پر فیاضیاں شروع کر دیں، یعنی حکومت کے طور طریق سے واقف تھے نہیں، کاشتکاروں کو اندھا دھند معافیاں دینی شروع کر دیں اور مالِ غنیمت

خود لے لیا۔

سورج مل کی بغاوت (سانحہ) اسی سال، سورج مل، جو بڑا طاقت ور زمیندار ہے اور اس کے آبا و اجداد (مغلیہ) بادشاہوں کی نوازشوں سے ہمیشہ بہرہ اندوز ہوتے رہے ہیں۔ اکبر آباد (آگرہ) و شاہ جہاں آباد (دلّی) کے مابین کی راہداری اُس سے متعلق تھی۔ اُس نے مسلمان امراء کی غفلت سے (فائدہ اٹھاکر) ان دنوں بغاوت کر دی اور اکثر محالات پر قابض ہو گیا، اور سیہ روزگار قلعہ دار کی نمک حرامی سے آگرے کا قلعہ بھی ہتھیا لیا۔ شاہ عالم نے شجاع الدولہ کی تحریک پر جواب اس کا وزیر ہے، بھاری لشکر کے ساتھ کوچ کیا۔ (یہ خبر) زبان زدِ خلق ہو گئی کہ (بادشاہ) سورج مل کو نکالنے کے لیے آ رہا ہے، زمیندار مذکور شہر اور قلعے کی حفاظت کے لیے اپنے قلعوں سے نکل آیا، (اور) جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہو (کر بیٹھ) گیا۔ اور راجا (ناگر مل) کو لکھا کہ تمھارا آنا زیادہ مناسب ہے۔ انھوں نے جو آشنائی پیدا کرنے میں ماہر تھے، سفیر بھیج کر (صلح کر لی) اور اُس فوج کو واپس لوٹا دیا۔

میرا آگرے جانا میں اس تقریب سے تیس سال کے بعد[ل] اکبر آباد گیا۔ اور اپنے والد اور چچا کے مزاروں کی زیارت کی۔ وہاں کے شاہو(ں)

ل میر نے (۳۰) سال کے بعد اپنا دوبارہ آگرے جانا لکھا ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ غلط ہے۔ عبارات ما سبق سے اتنا واضح ہو ہی چکا ہے کہ میر نادر شاہی حملے (۱۷۳۹ء) کے بعد (دوبارہ) دلی آئے تھے، اور وہ زمانہ اگر (۱۷۴۰ء) کا بھی سمجھا جائے تو سورج مل کی بغاوت جولائی (۱۷۶۲ء) کا واقعہ ہے، جس کی رو سے میر کا ۲۲-۲۳ برس کے بعد تیسری مرتبہ آگرے جانا ہوا نہ کہ تیس برس میں! (ن۔ا۔ف)

نے مجھے اِس فن کا امام سمجھ کر اکثر (مجھ سے) ملاقات کی۔

صاحب سُنّی نِکلے!

(حکایت) میں نے ایک عالم کی شہرت سنی، گیا اور ملاقات کی، مگر کور مغز ملّا نِکلا۔ یعنی بات کا مفہوم بھی نہ سمجھتا تھا! میں نے ابھی دم بھی نہ لیا تھا۔ کہ اُس نے احمقانہ بات شروع کر دی۔ کہ اِس زمانے کے اکثر نوجوان رافضی ہوتے ہیں۔ اور بزرگوں کے حق میں کیسی کیسی جھوٹی اور من گھڑت باتیں منسوب کرتے ہیں۔ تمھاری یہ خاکِ امام کی تسبیح جو ہم صفا پیشہ (لوگوں) کے لیے غبارِ خاطر کا سبب ہے۔ (اس بات کی) دلیل ہے کہ تمھارا میلان رفض کی طرف ہے۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں نے کہا مجھے خود یہی تردّد تھا (کہ آپ رافضی ہیں یا نہیں!) خدا کا شکر ہے کہ جناب سنّی نکلے۔ وہ مودھو میرے کنائے کو نہ سمجھا اور بہت خوش ہوا، جب مجھے اپنا ہم نوا پایا، تو اور بھی پوچ بکنا شروع کر دیا، میں نہایت بے مزہ ہوا، اور اُٹھ کر چلا آیا۔

آہ اے وطن!

(حکایت) میں صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کرنے کے لیے جاتا تھا جو بہت اچھی جگہ واقع ہے (یعنی) اُس طرف باغ ہیں۔ اِدھر قلعہ اور اُمرا کی حویلیاں گویا بہشت کی نہر ہے۔ میری معنی آفرینی کا شہرہ تو عالم گیر تھا، الھڑ حسین، سیاہ پلکوں والے، اچھی سج دھج والے، جامہ زیب اور پاکیزہ طینت، شاعر مجھے نہیں چھوڑتے تھے اور بڑی عزت کرتے تھے۔ دو تین بار سارے شہر میں گھوما، وہاں کے عالموں، فقیروں اور شاعروں سے ملا۔ (لیکن) کوئی ایسا مخاطب نہ ملا جس سے (بات کرکے) دلِ بیتاب کو تسلی ہو، میں نے سوچا

خدا کی شان! یہ وہی شہر ہے جس کی ہر گلی میں عارف، کامل، فاضل، شاعر، منشی، دانش مند، فقیہہ، متکلم، حکیم، صوفی، محدّث، مدرّس، درویش، متوکل، شیخ ملّا، حافظ، قاری، امام، موذن، مدرسہ، مسجد، خانقاہ، تکیہ، مہماں سرا، مکان اور باغ تھے۔ (اور) آج مجھے ایسی جگہ نظر نہیں آتی جہاں بیٹھ کر خوش ہو جاؤں، ایسا آدمی نہیں ملتا جس سے گفتگو کر سکوں۔ (شہر کو) ایک وحشت ناک ویرانہ پایا، (اور) نہایت صدمہ اٹھا کر لوٹ آیا۔ (اس طرح)، چار مہینے وطن مالوف میں گزارے رخصت ہوتے وقت آنکھیں بھر آئیں، سورج مل کے قلعوں میں واپس آگیا۔

میر قاسم کی معزولی

(سانحہ) یہاں آکر میں نے سنا، کہ قاسم علی[1] (خاں) ناظم بنگالہ اور اُن تجارت پیشہ نصرانیوں (انگریز) میں جو وہاں اک زمانے سے سکونت رکھتے تھے، جنگ چھڑ گئی۔ وہاں کی رعایا اور اُس ملک (بنگال) کے زمیندار، اُس کے بے اندازہ ظلموں سے عاجز آ گئے تھے، اس لیے انھوں نے (قاسم علی خاں کا) ساتھ نہیں دیا۔ آخر کار وہ شکست کھا کر، اور اپنی

---

[1] میر قاسم علی خاں، ستمبر (۱۷۶۰ء) میں میر جعفر کی معزولی کے بعد بنگال کے گورنر ہوئے، انگریزوں سے اُن کا معاہدہ تھا، لیکن انگریزوں نے اُس معاہدے کی خلاف ورزی کی اس پر میر قاسم نے فوج کشی کی مگر شکست کھائی (۱۷۶۴ء) اور شجاع الدولہ سے پناہ مانگی۔ انگریزوں نے شجاع الدولہ پر دباؤ ڈال انھیں وہاں بھی نہ جمنے دیا۔ آخر روہیل کھنڈ (ریاست گوہد) اور جودھپور میں کچھ دن گزار کر ۱۷۷۴ء میں شاہ عالم کی خدمت میں آئے یہاں بھی پناہ نہ ملی۔ آخر زمانہ سفر موضع کوتوالی میں نہایت کس مپرسی کے عالم میں بسر کیا۔ ۱۷۷۷ء (۱۷۹۱ء) میں انتقال ہوا۔ اور اُن کے ساتھ ہی بنگال کے صوبیداروں کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ (ن۔ا۔ف)۔

شکست خوردہ فوج، نیز زر و جواہر اور مال و منال (ساتھ) لے کر، عظیم آباد آ گیا جو اُسی کا صوبہ تھا۔ فرنگی بھی یہاں آ پہنچے، اُس نے چاہا کہ شہر بند ہو جائے اور پھر جنگ کرے لیکن اُس کے لشکر نے مُنھ موڑ لیا، اور دوبارہ شکست ہوئی۔ (چناں چہ) اپنا ساز و سامان لے کر نو دس ہزار فوج کے ساتھ شجاع الدولہ کی سرحد میں آ گیا، اُنھوں (انگریزوں) نے بالفعل (جنگ سے) ہاتھ روک لیا اور آگے قدم نہ بڑھایا۔ یہ (قاسم) جب بنارس کے قریب پہنچا تو وہاں خیمے ڈال کر (رُک گیا اور) وزیر (شجاع الدولہ) کو لکھا کہ "میں تمھاری امداد کے بھروسے پر آیا ہوں، اگر تم میری اعانت کرو اور نصرانیوں سے، جو (ہمارے) مذہب کے مخالف ہیں، جنگ کرنے کے لیے آ جاؤ تو تمھاری فوج اور ملازموں کا خرچ میرے متصدی اُٹھائیں گے۔" اُنھوں نے جواب دیا: "پہلے تم یہاں آؤ اور بادشاہ کی ملازمت کرو، (بادشاہ کے) حضور میں جو کچھ طے ہوگا اُس کے موافق عمل کیا جائے گا۔" وہ شامت کا مارا، اور انجام سے بے خبر، مع اسباب و آلات اور پانسو ہاتھیوں کے، کچھ حیلہ سازوں کے اعتماد پر جو بیچ میں پڑ گئے تھے، دریا سے جو شہرِ مذکور (بنارس) کے نیچے واقع ہے پار اُتر کر لشکر میں داخل ہو گیا۔ اِدھر کے لالچیوں کی نظر اُس کے شاہانہ اسباب پر پڑی تو ان کی نیت ڈانوا ڈول ہو گئی اور کچھ پرانے گھاگ بیچ کر اُسے حیلے حوالوں سے گرفتار کر لیا۔ دو تین دن بعد، زر و نقد، جواہر اور دوسرے اجناس اور گھوڑے، ہاتھی، بیل، اونٹ، خیمے، فرش، جو کچھ بھی تھا وزیر نے ناعاقبت اندیشوں کے کہنے سے (چھین لیا اور) اُس کے پاس کچھ (باقی) نہ چھوڑا۔ جو بد عہد درمیان میں واسطہ (بنے) تھے اُنھوں نے معاہدے کا (بھی) کچھ خیال نہ کیا۔

اور اپنے قول سے پھر گئے۔ (وہ بے چارہ یہ سوچ کر) آیا تھا کہ کوئی اُس کی اعانت کرے گا، اور وہ یہاں محفوظ رہے گا۔ مگر (اُلٹا لُٹ گیا اور) جب اُس نے پناہ طلب کی اور وزیر کا دروازہ کھٹکھٹایا، تو بیگم (والدہ شجاع الدولہ) کی سرکار سے، جو شجاع الدولہ ہی کا گویا دوسرا نام ہے، اُس کے لیے یومیہ (وظیفہ) مقرر ہو گیا باقی داستان یہیں چھوڑ کر اب دوسرا قصہ بیان کرتا ہوں۔

سورج مل کی جھڑپ

(سانحہ) سورج مل کا جو بڑا اجیالا سردار ہے، بڑا لڑکا جواہر سنگھ بہت دنوں سے ریاست (اپنے ہاتھ میں لینے) کا خواب دیکھ رہا تھا[1]۔ چناں چہ اب سے پہلے بھی اپنے باپ سے لڑ کر بڑی خوں ریزی کر چکا تھا، خود اُس کے بھی دو تین زخم کاری لگے تھے۔ اِن دنوں وہ فرخ نگر گیا جو شاہ جہاں آباد سے مغرب کی طرف تین منزل (کے فاصلے پر)، ایک شہر ہے اور جس کی سرحد اُس کے باپ (سورج مل) کی سرحد سے ملتی ہے۔ اور وہاں کے زمیندار سے، جس کا باپ دہلی کے نواح میں فوج داری پر (مامور) تھا، گتھ گیا۔ اِس آویزش نے طول پکڑا، وہ (زمیندار) بھی مونچھ نیچی کرنے پر تیار نہ ہوا، اور (لڑائی میں جی جان سے) جُٹ گیا۔ جب دو مہینے گزر گئے۔ تو سورج مل نے بڑی

---

[1] متن "ذکر میر" کے مرتب نے اس موقع پر عنوان "جواہر سنگھ کی دست درازی اور نجیب الدولہ کی گوشش مالی" غلط قایم کیا ہے۔ نجیب الدولہ کی جھڑپ سورج مل سے ہوئی ہے نہ کہ جواہر سنگھ سے۔ میر نے اِسی جنگ کے بیان میں آگے چل کر نام بھی لکھ دیا ہے۔ "امّا کسے ندانست کہ ایں سورج مل است" (ن-ا-ف)

بھاری سپاہ لے کر اُدھر کا رُخ کیا۔ اور راجا (ناگرمل) کے ہاں رخصت ہونے کے لیے آیا۔ اُنھوں نے مشورہ دیا کہ "تم ہرگز مت جاؤ، ایسا نہ ہو کہ تمھاری وجہ سے فتنہ و فساد زیادہ بڑھ جائے۔ وہاں نجیب الدولہ بھی نزدیک ہے، اگر اُس نے مسلمانوں کی رعایت کی تو جنگ چھڑے گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ فریقِ ثانی کے پاس قلعہ ہے، فوج ہے، اگر اُس نے سماجت کی۔ اور دیر ہو گئی تو تمھاری شانِ عظمت پر بٹا لگے گا۔ آدابِ ریاست میں لکھا ہے کہ جب تک کام تقریر (نوکر کو حکم دینے) سے نکلتا ہو، سردار کو چاہیے کہ لڑکے سے نہ کیے اور لڑکے سے بھی جہاں تک ممکن ہو خود نہ جائے (وہ بھی کسی ملازم کو مامور کرے)۔" لیکن جب موت سر پہ منڈلانے لگتی ہے تو (کانوں میں) منخیں لگ جاتی ہیں، اور انسان معقول بات نہیں سُنتا۔ اُس نے بھی (راجا ناگرمل کے) مشورے کو ایک کان سے سُنا دوسرے سے اُڑا دیا۔ خود گیا اور وہاں کے رئیس کو قید کر لیا۔ اُس کے سپاہیوں نے دستِ ظلم دراز کیا اور وہاں کے شرفا کے مکانوں کو لوٹ لیا۔ (رئیس مذکور کے) بھائیوں نے جو نجیب الدولہ کے ساتھ تھے (نجیب الدولہ سے) فریاد کی۔ اور اپنی بے طاقتی کا اظہار کیا۔ اُس نے اِن کی خاطر التجا کی کہ "وہ لوگ (اپنی) سزا کو پہنچ گئے، اب (اُنھیں) معاف کر دینا چاہیے۔ مگر اُس نے ایک نہ سُنی اور شاہ جہاں آباد کی طرف بڑی دلیری سے بڑھا۔ (نجیب الدولہ) نے بے پروائی کے ساتھ شہر کے دروازے بند کرا دیے اور جنگ کے ارادے سے باز رہا۔ یہ مغرور و متکبر اپنے گھمنڈ میں رہا اور دریا سے پار اُتر کر تازہ آفت پیدا کر دی۔ اُس (نجیب الدولہ) کی انسانیت میں شبہ نہیں، (اُس نے) سو بار کہلا بھیجا کہ "میں تم سے جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا اس لیے اپنی فوج کو نہیں نکالا ہے،

شہر کے غریب لوگ (مفت میں) تکلیف اُٹھائیں گے۔ یہاں محاصرہ کرنا مناسب نہیں ہے۔" لیکن (سورج مل نے) ایک جواب بھی انسانیت کا نہیں دیا اور کمین پن کا جواب یہ بھیجا کہ "میں تو نواب کی فوج دیکھ کر واپس جاؤں گا۔ اگر جلدی (شہر سے) باہر نکل آئیں تو احسان ہوگا کیوں کہ مجھے اور بھی کام درپیش ہیں۔ نہیں تو یہ فوج، جو میرے اختیار میں نہیں ہے، صبح شام میں شہر پر دھاوا کیا ہی چاہتی ہے۔" اُس سردار (نجیب الدولہ) نے کہا کہ "(اچھا تو) ہم صبح ضرور باہر نکلیں گے اور اپنی فوج کے دم خم تمھیں دکھا دیں گے!"

(نقل) ایک شخص نے جو وہاں موجود تھا، مجھ سے بیان کیا کہ آدھی رات گئے (نجیب الدولہ) نے فوج کو دریا کے پار کرنے کا حکم دیا اور خود لمبی تان کر سو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بیدار ہوا، اور کہنے لگا کہ "میں نے عجب واقعہ (خواب میں) دیکھا ہے" لوگوں نے کہا: "وہ کیا؟" اُس نے کہا: "ایک درخت پر ایک بڑا کوّا بیٹھا ہے اور بہت سے کوّے اس کے چاروں طرف جمع ہو کر شور و غل مچا رہے ہیں۔ میں اُس راستے سے گزرا ہوں، اور ایک ہی تیر میں اُس کوّے کو ڈھیر کر دیا ہے۔ (باقی سب) کوّے اُسے مرا ہوا دیکھ کر یکبارگی اُڑ گئے ہیں۔ غالب ہے کہ مجھے فتح ہوگی۔ انشاء اللہ صبح کو سوار ہو کر اس موذی کو ختم کر ڈالوں گا۔!"

جب صبح ہوئی، آسمان نے تیغِ حادثہ کھینچی، جنگ کا نقارا بجا (نجیب الدولہ) ہاتھی پر سوار ہو کر دریا سے پار اُترا، اور نہایت دل جمعی کے ساتھ مقابلے میں ڈٹ گیا۔ حریف نے بڑے گھمنڈ اور غرور کے ساتھ اپنی فوج کے دستوں کو مقابلے کے لیے بڑھایا۔ تفنگ انداز تفنگ چلانے میں (مصروف ہوئے) اور

آزمودہ کا سپاہی جنگ کے طور طریقوں میں (لگ گئے)۔ یہ سردار (نجیب الدولہ) تو پہلے ہی پھُنکا بیٹھا تھا، حسبِ معمول نہایت دلیری سے لڑا۔ اِدھر کے رئیس (سورج مل) نے جی توڑ کوشش کی اور کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔

جب روہیلوں نے کُشت و خون شروع کیا تو سورج مل نے اپنے تئیں فوج میں چھپا دیا اور اِس سے غافل ہو کر کہ موت اُس کی گھات میں ہے۔ بالا بالا نکل کر اُس فوج پر ٹوٹ پڑا جو شہر کی جانب تھی۔ اس پر ایک شور برپا ہو گیا۔ اِدھر (نجیب الدولہ کی فوج کے) قلب سے کچھ فوج اُن کی امداد کے لیے بھاگی، اور اِس مصیبت کو دور کیا۔ اِسی گرد و غبار میں اُس اجل رسیدہ کے ایسا زخم لگا کہ گھوڑے سے زمین پر گِرا اور مر گیا، لیکن کسی کو پتا نہ چلا کہ یہ سورج مل ہے۔ (لوگ) آپس میں چہ می گوئیاں کر رہے تھے کہ جب اُس کا گھوڑا سامنے آئے گا تو گویا ایک قیامت نمودار ہو گی۔ اُنھیں یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ (اِسی) پیش جنگی میں مارا گیا ہے۔ (پھر) اُس وقت سے شام تک باہم جنگ نہ ہوئی۔ وہاں تو (اُس کا) کام تمام ہو گیا تھا اور (یہ) یہاں ڈر رہے تھے کہ رات ہو گئی ہے ایسا نہ ہو کہ شب خون مارے اور ہمیں ہلاک کر ڈالے۔ شام کے بعد (مقابل کی) فوج منتشر ہو کر چلی گئی۔ یہ آدھی رات تک (جنگ کے) ارادے سے گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار کھڑے رہے، لیکن سب اس فکر میں تھے کہ آخر (یہ) کیا بلا ہے اُدھر سے چیکار بھی نہیں آتی، ایسا نہ ہو کہ حریف فوج غفلت میں (ہم پر) حملہ کرے اور قیامت برپا کر دے۔ (اِدھر کے) لشکر سے جاسوس نکل کر دو دو تین تین کوس تک اِدھر اُدھر گھومے لیکن چڑیا کا بچہ بھی نہ ملا۔ آخر شب میں اُنھوں نے آ کر بتایا کہ گاؤں والوں سے یہ

سُنا گیا کہ ایک جماعت بڑی بدحواسی (کے عالم) میں کہتی جا رہی تھی: "افسوس ہے کہ سورج مل جیسا سردار مارا جائے، اور ہم بے مروّت اُس کی نعش کو میدان میں (پڑا) چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ آئیں"۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سہ پہر کی شورش میں، جو محافظ فوج سے ہوئی تھی، مارا گیا اور اس کا لشکر بھاگ گیا۔

اِن ہی باتوں میں (لگے ہوئے) تھے کہ صبح نمودار ہوئی (تو) ایک سوار، ایک کٹا ہوا ہاتھ لایا اور کہنے لگا یہ اُس کا وہی ہاتھ ہے جس میں زخم تھا۔ دوسرے لوگوں نے بھی شناخت کیا، اور خوشی کے شادیانے بجانے لگے۔ جب یقین ہو گیا تو (بھاگی ہوئی) فوج کا تعاقب شروع کیا، اور اُن کے پیچھے لگ گئے، اگر وہ دریا پار اُتر جاتے تو ایک جہان کو تباہ کر ڈالتے، لیکن راجا نے لکھا کہ نواب نے یہ دولت یعنی ایسی شاندار فتح مفت میں حاصل کرلی ہے، اب مناسب ہے کہ اِسے غنیمت سمجھیں اور باگیں (آگے بڑھنے سے) موڑ لیں۔ یہاں بڑی جمعیت موجود ہے اگر اُنھوں نے ہمت سے مقابلہ کیا تو پھر مشکل ہو جائے گی۔ (نجیب الدولہ) سُلجھا ہوا دماغ اور قلبِ سلیم رکھتا تھا، اس نے راجا (ناگرمل) کا خط دیکھا (تو) واپس ہو گیا۔

جواہر سنگھ جس کی جان یہ خبر سُن کر (ہی) نکل گئی تھی اور بظاہر خود کو سنبھالے ہوئے تھا آیا اور مسندِ ریاست پر متمکن ہو کر لشکر جمع کرنے کی فکر میں لگ گیا، ہمت اور شجاعت اور مروّت میں وہ اپنے باپ سے سو گُنا بہتر ہے ع:

"دولت نہ دہد خدائے کس را بغلط"

لشکرِ بادشاہ اور وزیر کی حقیقت

(سانحہ) ہوا یہ کہ، شجاع الدولہ نے کچھ ناتجربہ کاروں اور نااہلوں کے

کے سمجھانے سے، جو اس کی ناک کا بال بنے ہوئے تھے، اِس لالچ میں کہ اگر صوبہ عظیم آباد ذرا سی تگ و دو سے ہاتھ آجائے تو مفت برابر ہے، شاہ عالم کو اپنے ساتھ لے کر اُس طرف لشکر کشی کر دی۔ عیسائیوں کے کشیش، یعنی فرنگیوں کے سرداروں نے شہر کی حفاظت کے انتظامات (مکمل) کر کے (اُنھیں) لکھا کہ، "ہمیں جس سے پرخاش تھی اُسے ہم نے مار لیا۔ اور اِس ملک سے نکال دیا، (اب) ہمیں نواب (شجاع الدولہ) اور بادشاہ سے کوئی سروکار نہیں، پھر اس حرکت (فوج کشی) کا سبب معلوم نہیں کیا ہے؟ اور فتنہ و فساد کے سلسلے کا محرک کون ہے؟ اگر ہم سے اطاعت (قبول کرانا) منظور ہے تو ہم پہلے سے ہی مطیع و منقاد ہیں، بے فائدہ زحمت اُٹھانے کی کیا حاجت ہے؟ اور اگر کچھ بے سمجھ لو دولتوں کے اُکسانے پر ہمارا استیصال (ہی) مقصود ہے، تو ہم کیا کر سکتے ہیں، بڑے لوگوں کا مزاج سیلاب کی طرح تُند ہوتا ہے، جدھر کو چل پڑا، بس چل پڑا، ہم (لوگ) خس و خاشاک (ہیں) ہماری کیا طاقت اور سرو سامان ہے جو اُس کے سدِ راہ ہو سکیں۔ سرداروں کی طبیعت کو آندھی سے تشبیہ دی جاتی ہے، ہم مشتِ خاک ہیں، (ہمارے پاس) کیا ساز و برگ رکھا ہے جو اُس کا راستہ روک دیں!"

لیکن شاہی مشیروں نے جو نامعاملہ فہم تھے اور عقل و شعور سے بیگانے، اِس تحریر کو (فرنگیوں کی) بزدلی اور نامردی پر محمول کیا اور باصرار کوچ کرنے کا مشورہ دیا۔

جب اُس شہر (عظیم آباد) کے نواح میں دونوں فریقوں کی ملاقات ہوئی تو فرنگی بندوقیں لے کر لڑائی پر تُل گئے اور نمک حرام مغل آقا کے خزانوں پر

جھپٹ پڑے۔ عیسائیوں نے بڑی جرات سے مقابلہ کیا۔ نواب کے ایک چیلے عیسٰی نامی نے دلیری کا مظاہرہ کیا اور (لڑتا ہوا) مارا گیا۔ بادشاہ (فقط) تماشائیوں کی طرح کھڑا (دیکھتا) رہا۔ (انجام یہ ہوا کہ) شکست ہوگئی۔ نواب نے جو (شہر کے) آس پاس (کہیں) لڑ رہا تھا، توقف کرنا خلافِ مصلحت دیکھا، اور (باقی ماندہ) چند (لوگوں) کے ساتھ (اپنے) صوبے کی طرف چلا گیا۔ (اتنی) لمبی مسافت (صرف) ڈیڑھ دن میں طے کرکے اپنے ٹھکانے پر آگیا۔ وہاں سے نقد وجنس اور فوج بقدرِ ضرورت لے کر فرخ آباد روانہ ہوا۔

کَل جُگ نہیں کَر جَگ ہے یہ!

اگرچہ یہ دنیا دارِ جزا نہیں، لیکن کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے (کہ بدلہ ہاتھ کے ہاتھ مل جاتا ہے چناں چہ) اِس بھاری لشکر کی یہ شکستِ فاش اُس (غداری) کا بدلہ تھی، جو اُنھوں نے قاسم علی خاں سے کی تھی۔!

شاہ عالم کا وظیفہ

اُدھر نصرانیوں نے خیموں اور آلاتِ جنگ وغیرہ پر قبضہ کر لیا، اور بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر اطمینان کے ساتھ اس طرف عازم ہوئے۔ آٹھ سات دن کے عرصے میں اودھ پہنچے جو شجاع الدولہ کا مستقر ہے، اور اِس فتح کے شکرانے میں جو اُن کے تصور سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی، یہاں کسی شخص کو آزار نہیں پہنچایا۔ ایک ہفتے کے بعد بادشاہ کا دو لاکھ روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا کہ حضرت بطورِ خود رہیں، اب ہم جانیں اور ملک!

(سانحہ) اِسی دوران، جواہر سنگھ اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ملہار (راؤ ہلکر) کی اعانت سے جس کا احوال پہلے لکھا جاچکا ہے، بھاری لشکر لے کر

نجیب الدولہ پر حملہ آور ہوا، اور دہلی کا محاصرہ کر لیا، اناج کی مہنگائی سے مخلوق تنگ آ گئی، جنگ و جدال اور کُشت و خون (کا سلسلہ) قریب دو مہینے (جاری) رہا۔ عماد الملک جو (اِس جنگ سے) کنارا کرنے کی فکر میں تھا (اپنی) فوج کے ساتھ بھرت پور کے قلعے سے نکلا اور فالتو لوگوں کو فرخ آباد بھیج کر جواہر سنگھ کا شریک ہو گیا۔

آخر شاہ (ابدالی) کی آمد آمد (کی خبر) سے جو اس سال شاہ آباد تک آیا تھا، لیکن سکھوں کی شورش سے ناکام لوٹ گیا، ساری اسکیمیں ناکام ہو گئیں۔ یہ جنگ (بھی) صلح پر ختم ہو گئی۔ عماد الملک (تو) ملھار کے ساتھ، احمد خاں بنگش کے پاس چلا گیا جس سے (اس کے) تعلقات استوار تھے، اور جواہر سنگھ اپنے ملک میں آکر دوسرے کاموں میں لگ گیا۔ (اُس نے) اپنے باپ کے زمانے کے سرداروں کو جو اُسے خاطر میں نہیں لاتے تھے (اس طرح ہموار کیا کہ) کچھ کو قتل کرا دیا اور بعضوں کو قید کر لیا۔

عماد الملک نواب عماد الملک اِس سن و سال کے باوصف، یگانۂ روزگار ہیں بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، چناں چہ پانچ چھ خط (خوش نویسی کے) بخوبی لکھتے ہیں، ریختہ اور فارسی دونوں میں بامزہ شعر کہتے ہیں، اور فقیر (میر) کے حال پر بہت ہی عنایت فرماتے ہیں۔ ہیں، جب بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں تمتع اُٹھایا ہے۔

شجاع الدولہ کی انگریزوں سے طلبِ امداد (سانحہ) شجاع الدولہ کا حال یہ ہے کہ وہ جب

لوگوں کی حمایت کے بھروسے پر فرخ آباد میں پڑا ہوا تھا، اُن سے سوائے بے مروتی اور طوطا چشمی کے کچھ ہاتھ نہ آیا (تو)، ناچار ملھار کے ساتھ، جس کے حالات پہلے لکھے گئے ہیں، دوستی گانٹھ کر فوج جمع کی۔ اور (اُنھیں) فرنگیوں سے جنگ کے لیے لے گیا۔ جب فریقین کا مقابلہ ہوا (تو فرنگیوں نے) دونوں جانب سے توپوں کی باڑھ لگا دی اور (اِنھیں) گھیر لیا۔ دکھنی فوج کے دستوں نے اپنی بہادری دکھانے کے لیے توپ خانے پر جاکر نیزہ بازی کی اور مار دھاڑ شروع کی۔ عیسائی (فوج) دائرۂ لشکر سے چھپکے سے نکل آئے اور گولا باری کرتے ہوئے (اچانک) ایسے حملہ آور ہوئے کہ دکھنیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور ساری شیخی کرکری ہو گئی (اور یوں) بدحواس ہو کر بھاگے جیسے گدھے کے سر سے سینگ! دو تین دن کے اندر گوالیار پہنچ گئے جو آگرہ سے تین منزل (کی مسافت) پر راجدھانی ہے اور اُن کے قبضے میں تھی۔ چند دنوں میں (اُنھوں نے) اپنے پھٹے ٹوٹے حال کو درست کیا اور (پھر) جواہر سنگھ سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اُدھر شجاع الدولہ کا قضیہ نمٹ گیا، وہ اپنی موت سے بے پروا ہو کر تن تنہا فرنگیوں کے پاس چلا گیا۔ (فرنگیوں نے) اُس سے شرم کی اور تمام چیزوں سے دست بردار ہو گئے۔ (اور) اُس کے صوبوں کو اُس پر چھوڑ کر عظیم آباد چلے گئے۔ جب (بادشاہ اور وزیر کا) رفعِ حجاب ہو گیا تو (شجاع الدولہ نے) دوبارہ وزارت کا خلعت پہنا اور بخیت ہو کر اپنے مستقر یعنی اودھ میں آ (کر بیٹھ) گیا۔

جواہر سنگھ اور مرہٹوں کی جنگ

(سانحہ) اِدھر یہ تیرہ روزگار دکھنی (مرہٹے) بھاری لاؤلشکر کے ساتھ جواہر سنگھ کی سرحد

تک آ گئے اور اکثر دیہاتوں کو تاخت و تاراج کر دیا۔ جواہر سنگھ جو واقع میں بڑا بہادر ہے، (اپنے) قلعوں سے نکلا (اور) آٹھ نو ہزار سکھوں کو جو اُن دنوں اس ضلع میں آئے ہوئے تھے، نوکر کر کے لے گیا اور مقابلہ کیا۔ جب جنگ چھڑی، تو اُن (مرہٹوں) کے ہوش پراں ہو گئے اور یہ اُن کے تعاقب میں لگ گئے۔ چناں چہ قریب پانسو آدمیوں کو مع ایک سردار کے پکڑ لائے اور اُن کے تمام آلاتِ جنگ لے گئے۔ ملھار جو، کہ غیرت مند آدمی تھا، (جب) اُس نے شکست پر شکست کھائی تو فرطِ اندوہ و غم سے تین چار منزل آگے جا کر مر گیا۔

مرہٹوں نے صلح کر لی

اندریں اثنا، رگھناتھ راؤ جو دکھنیوں کا مانا ہوا سردار ہے، کثیر فوج کے ساتھ پہنچا اور جواہر سنگھ کی سرحد کے اُس طرف کے زمینداروں میں سے ایک پر چڑھائی کر کے اس کے ملک میں فتنہ کھڑا کر دیا۔ زمیندار مذکور اُن سے پرخاش رکھتا تھا، اُس نے (جواہر سنگھ کو) لکھا کہ اگر مرہٹے مجھے دبا لیں گے تو یہ یقینی ہے کہ تمھارے ملک پر بھی ہاتھ صاف (کرنے کی کوشش) کریں گے۔ تمھارا (اپنی) سرحد پر آنا ضروری ہے اور میرا فائدہ بھی اِسی میں ہے۔ یہ فراخ دامن جوان (جواہر سنگھ) بے پایاں لشکر کے ساتھ گیا اور چنبل جو ایک مشہور دریا ہے (اُس کے) اس طرف پڑاؤ ڈال دیے۔ دکھنیوں نے پریشان ہو کر اور بھی کاوش شروع کر دی (مگر) ابھی دونوں لشکر محاذوں پر ہی (تیاری میں مصروف) تھے کہ شاہ (ابدالی) کے آنے کا غلغلہ بلند ہوا، اُسی کے نام سے دکھن کے سرداروں کا پیشاب خطا ہوتا تھا۔ وہ سر پر پانو، رکھ کر اپنے اپنے وطنوں کو بھاگ گئے اور اُن قیدیوں کو رہا کرنے کی شرط پر صلح کر لی جنھیں ملھار کی

جنگ میں پکڑ لیا گیا تھا۔ اُس عزیز (جواہر سنگھ) نے نمک حراموں کی مناسب گوش مالی کی جو مرہٹوں سے ساز باز کر کے افواہیں پھیلا رہے تھے، اور اکبر آباد (واپس) آگیا۔

میرا سفرِ آگرہ

راجا (ناگرمل اپنے) قلعوں سے نکل کر اُس کی ملاقات کے لیے (آگرے) گیا، مجھے اِس تقریب سے اپنے باپ اور عمّ بزرگوار کے مزاروں کی زیارت پھر میسّر ہوگئی۔ تقریباً پندرہ روز وہاں رہ کر واپسی ہوئی۔

ابدالی کا حملہ

اِس بار بھی شاہ درّانی ستلج کے جو ایک مشہور دریا ہے، اِس طرف تک (آیا) اور بے حقیقت سکھّوں کے ہاتھوں نقصان اُٹھا کر واپس ہوگیا۔

جواہر سنگھ اور مادھو سنگھ کی جھڑپ

(سانحہ) اسی زمانے میں جواہر سنگھ اور مادھو سنگھ پسر جے سنگھ کے مابین زمینداری کے معاملات میں سے کسی معاملے پر تلخی ہوگئی اور (وہ) رفتہ رفتہ جھگڑے کی صورت اختیار کر گئی۔ اُس بہادر جوان نے اُس کے ملک کا ستیاناس کرنے پر کمر باندھلی۔ اور بظاہر بخت سنگھ جس کا احوال میرا سحر طراز قلم پہلے لکھ چکا ہے، کے لڑکے راجا بجے سنگھ کی ملاقات کے بہانے سے بھکر گیا، جو ایک بڑا تالاب ہے۔ اور ہنود وہاں اشنان کرنے کو عبادت سمجھتے ہیں۔ اُس نے راستے میں اکثر دیہاتوں کا تہ وبالا ایک کر دیا۔ بجے سنگھ اگرچہ جوان تھا، لیکن پختہ رائے کا تھا، وہ آکر (اُس سے) ملا اور درمیان میں پڑکر صلح کرادی، باہم عہد و پیمان ہوگئے۔ (رائے بہادر سنگھ راجا کا بڑا بیٹا جو ہمت و شجاعت والا جوان ہے، جواہر سنگھ کے ساتھ اُس

تالاب میں غسل کرنے کے لیے گیا تھا، جب وہاں سے واپسی ہوئی] جب جواہر سنگھ واپس ہوا تو راجا مادھو سنگھ کے سرداروں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، جنگ شروع کر دی دوپہر تک تیر و تفنگ کے ساتھ جنگ ہوتی رہی۔ آخر (میں) جہالت کیش راجپوت گھوڑوں سے اُتر پڑے اور تلوار سے (دست بدست) لڑائی ہونے لگی۔ (لیکن) اکثر کے پانو اُکھڑ گئے اور یہ دلاور جوان [جواہر سنگھ درائے بہادر سنگھ] ایسی کڑی آفت کا مقابلہ کر کے دادِ شجاعت دیتے رہے۔ شام ہوئی تو دونوں لشکروں کے چھکے چھوٹ گئے۔ (اب) کینے کی تیز آگ دونوں طرف بھڑک رہی ہے اور رعایا مثل خس و خاشاک کے جلی جاتی ہے، دیکھنا چاہیے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔

سکھ فوج کی بدعہدی

(سانحہ) جب جواہر سنگھ اپنے قلعوں میں آ کر بیٹھ گیا تو راجپوتوں کی فوج بڑی بے دردی سے آس پاس کے گانو لوٹنے لگی۔ اور دکھنیوں کی پشت پناہی سے آبادیوں کو اُجاڑنا شروع کر دیا۔ اِن دنوں سکھوں کی ایک فوج دریائے جمن کے اُس طرف موجود تھی، اِدھر کے رئیس (جواہر سنگھ) نے اُن سے ساز باز کر کے مقابلہ کیا۔ خوب کُشت و خون ہوا عالم تباہ ہو گیا، آخر (جواہر سنگھ نے) حریف کی فوجوں کو اپنے مُلک سے نکال کر سکھوں کے سرداروں کو اُن کے پیچھے لگا دیا، اور اپنا جانا خلافِ

لہ قوسین کی یہ عبارت ذکرِ میر کے مطبوعہ متن میں نسخۂ رامپور کے حوالے سے حاشیے پر لکھی گئی ہے، اس لیے ہم نے اِسے ترجمے میں بھی نمایاں کر دیا ہے۔ (ن - ا - ف)

مصلحت سمجھا۔ اِس غدّار قوم نے اُن سے گٹھ جوڑ کر لیا اور اُس سردار کو دھوکا دیا۔ جب (جواہر سنگھ نے) اِس بے سر دپا قوم کی بدعہدی دیکھی تو بہت بے مزہ ہوا۔ لیکن اِسی حال میں (اُس کے) اقبال نے یاوری کی کہ راجا مادھو سنگھ اپنی بیماری کے سبب مرگیا۔ اُس کی فوج کے سرداروں نے مجبوراً صلح کر لی اور واپس ہو گئے، اور یہ بے تہ سکھ بھی اُسی راستے سے نکل گئے۔

جواہر سنگھ کا قتل

(ایک عظیم سانحہ) اور وہ یہ کہ اس عرصے میں جواہر سنگھ اکبر آباد چلا گیا اور کسی بدبخت کے ہاتھوں، تلوار کے ایک ہی وار میں دنیا سے رخصت ہو گیا[1]۔ اب ریاست اُس کے بھائی راؤ رتن سنگھ کو ملی، یہ سیہ کار ہمیشہ شراب میں دُھت رہتا تھا، اور خلقِ خدا پر حد سے زیادہ ظلم کرتا تھا، چناں چہ دس مہینے کی (مدت) ریاست میں اُس نے ہر کس و ناکس سے بدسلوکیاں کیں۔ انجام کار کسی مہوّس نے اُسے بھی چاقو سے ہلاک کر ڈالا۔ (اب) سردار اُس کے (نابالغ) بیٹے کے نام سے کھیری سنگھ مقرّر ہوا۔ اختیارات ملازموں کے ہاتھوں میں رہے۔ (جس کے باعث) سارا کام ابتر ہو گیا۔

اب کار پردازوں نے سورج مل کے چوتھے بیٹے نول سنگھ کو جو اُس وقت موجود نہیں تھا، اُس (نابالغ) لڑکے کی نیابت میں لے لیا ہے اگر سلیقے سے حکومت چلالیں تو اچھا ہے، ورنہ ڈھنگ تو بگڑے ہوئے (نظر آرہے) ہیں۔

جب اِس قوم کے نفاق نے طول پکڑا اور ملک کے انتظام کی نوبت کرکمیٹوں تک پہنچی (تو) نول سنگھ اور (اُس کا) چھوٹا بھائی رنجیت سنگھ جس نے کمبھیر کا قلعہ

---

[1] سنہ ۱۷۶۸ء

متعلق ہے۔ دونوں جنگ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تقریباً پندرہ دن تک توپ و تفنگ کے ساتھ جنگ ہوتی رہی۔ چوں کہ قلعہ مضبوط تھا، ناچار نول سنگھ نے صلح کر کے چھوڑ دیا۔ ہر چند بظاہر دونوں بھائیوں میں صلح و صفائی ہو گئی ہے۔ لیکن کینۂ باطن کا کیا علاج ؟ جیا رام، جو رنجیت سنگھ کی فوج کا سردار اور مدار المہام تھا، دکھنیوں کے لشکر میں گیا، جو ان دنوں وہاں سے چار پانچ منزل (کے فاصلے) پر منڈلا رہے تھے۔ اور (مرہٹہ) سرداروں کو لالچ دے کر اپنے ملک میں لے آیا۔ یہی (مرہٹے) جو اب دُون کی لے رہے ہیں (بہت) پھٹے حالوں میں اُس کے ساتھ آئے (تھے) اور قلعۂ کمھیر کی دیواروں کے نیچے محاصرہ کر کے پڑ گئے (تھے)، مگر اتنے ہراساں تھے کہ ہر شخص سے پوچھتے تھے "نول سنگھ کی فوج کتنی ہے؟ اور کیسے لڑتی ہے؟" اگر نول سنگھ اپنی جگہ سے نہ ٹلتا تو اس کا اتنا نقصان نہ ہوتا۔ اور مرہٹے بھی تھوڑا بہت (مال) بطریقِ ضیافت لے کر واپس ہو جاتے۔ چناں چہ اُنھوں نے متھرا کی جانب حرکت شروع کر دی تھی، (لیکن) رات کے وقت نول سنگھ کی فوج کے ناتجربہ کار سرداروں نے گوردھن کے قریب، کہ وہ بھی ہندؤوں کی عبادت گاہ ہے آ کر ان پر قزاقانہ حملہ کر دیا (اور ایسے کیا کہ) سَو یہاں ہیں تو دو سَو وہاں، ہزار اِدھر تو پانچ سو اُدھر، اسی لیے جو جس جگہ بھی تھا وہاں تنہا (ہی) رہا، کوئی کسی کی دادرسی نہ کر سکتا تھا (لا محالہ اس کا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ) نسیمِ فتح و ظفر دکھنیوں کے پھریروں پر لہرائی۔ اِدھر کے گھوڑے، ہاتھی، اونٹ اور بہت سا سامانِ جنگ اُن لوگوں کے ہاتھ آیا، (لیکن) ایسی شکست (دینے) پر بھی (اُن سے) یہ نہ ہو سکا کہ نول سنگھ کے قلعے کو فتح کر لیتے۔ (اسی کو) غنیمت سمجھ کر دریائے جون سے گزر گئے، اور دوآبے کے درمیان خیمہ زن ہوئے۔ جب انھیں وہاں پڑے پڑے ایک عرصہ

گزر گیا، (تو) نجیب الدولہ نے جو بہت دُور اندیش تھا، سوچا کہ یہ مصیبت یوں بالا ہی بالا نہیں جائے گی مبادا شہر کو گزند پہنچائے (چنانچہ) وہ اپنے بیٹے (اور) بھائی (کو)، نیز جتنی (بھی) فوج ہمراہ تھی لے کر نظر بتوکّل (مرہٹہ) سرداروں کے مقابل آیا اور جب تک جان میں جان رہی، دکھنیوں کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ شہر کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لیں۔ مگر جب وہ اپنے پرانے مرض (کی شدت) سے مرگیا تو اس کے سرداروں نے کسی معمولی بات پر اُس کے بیٹے ضابطہ خاں سے اختلاف پیدا کر لیا۔ وہ (ضابطہ خاں پر مہم) چھوڑ چھاڑ کر سکرتال چلا گیا، اور اُنھوں نے شہر کے قریب آکر خیمے لگا دیے۔

پھر کاماں میں

جب جاٹوں کی شورش اور فتنہ انگیزی حد سے بڑھنے لگی اور زندگی (ان کے ہاتھوں) اجیرن ہوگئی تو راجا ناگرمل نے بیس ہزار (دہلی والوں کے) گھروں کو لے کر جو اُسی کی وجہ سے آباد تھے، اور (ان میں سے) اکثر اُس کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے، نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ اور ادھر کے سرداروں سے اجازت طلب کی۔ لیکن وہ ظالم تو (ان) لوگوں کو ستانے کی گھات میں تھے اور چاہتے تھے کہ (راجا کو) لیت و لعل میں رکھ کر اُس کا ارادہ فسخ کرا دیں (پھر موقع پا کر) خاموشی سے دستِ ظلم دراز کریں۔ (راجا کو) جب یہ یقین ہو گیا کہ یہ (جاٹ) لوگ جانے نہیں دیں گے بلکہ سدِ راہ ہوں گے تو راجا نے خدا پر نظر کر کے وہ کیا جو سرداری کا لازمہ ہے (یعنی) بڑی جرأت سے اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر سوار ہوا، قلعے سے باہر آیا اور غریبوں کی امداد میں اتنا متوجہ ہوا کہ ایک شخص کی ناموس بھی وہاں (خطرے میں) نہیں

چھوڑی۔ خدا کے فضل اور اپنے حسنِ نیت کی برکت سے، دو تین دن میں اس بھاری قافلے کے ساتھ شہر کاماں میں داخل ہوا جو (جے پور کے موجودہ رئیس) راجا پرتھوی سنگھ پسر راجا مادھو سنگھ کی سرحد پر واقع ہے۔ (اب) ہم مصیبت کے مارے بھی اس کی نوکری کے تعلق سے اسی قافلے کے ساتھ اقامت گزیں ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ آب و دانہ کچھ دن یہیں رکھتا ہے یا کہیں اور لے جاتا ہے۔

میرا دلّی میں ورود

(سانحہ) ان دنوں مشہور ہوا کہ شاہی اقبال کے جھنڈے فرخ آباد پر سایہ فگن ہیں۔ راجا نے مجھے (بطور سفیر) حسام الدین خاں کے پاس بھیجا جو بادشاہ کے مزاج میں دخیل تھے۔ میں نے جا کر عہد و پیماں کیے۔ اِدھر اس کے چھوٹے بیٹے نے جو مجھ سے اس لیے خوش نہیں تھا کہ میں اس کے بڑے بھائیوں سے زیادہ مراسم رکھتا ہوں۔ (معاہدے کے علی الرغم اپنے باپ کو مشورہ دیا کہ دکھنیوں کے پاس جانا زیادہ اچھا ہے۔ چنانچہ (وہ لوگ) بادشاہ کے لشکر میں نہیں گئے اور شہر (کی طرف) عازم ہوئے۔ مجبوراً میں بھی مع (اپنے) متعلقین کے بڑی بے آبروئی کے ساتھ ان کے ہمراہ ہو لیا۔ جب شہر دلّی میں پہنچا (تو) بیوی بچوں کو سرائے عرب میں چھوڑ کر (راجا کے قافلے سے) علیحدہ ہو گیا [دو تین دن کے بعد رائے بہادر سنگھ سے ملاقات کر کے تمام حقیقتِ حال بتائی گئی اس نے اپنے مقدور بھر، ہمارے حالِ خراب کو سنوارنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، اور امداد دی]۔

ضابطہ خاں پر چڑھائی

اسی زمانے میں سندھیا جو دکھنی سرداروں میں سے ایک بڑا سردار ہے آگے گیا اور بادشاہ کو اپنے

ساتھ لے کر شہر میں داخل ہوا۔ اس (بات) کو ابھی کچھ (دن بھی) نہیں گزرے تھے کہ کہ (مرہٹہ) سرداروں نے باہم طے کیا کہ بادشاہ کو اپنے ساتھ لے کر نجیب الدولہ مرحوم کے لڑکے ضابطہ خاں پر چڑھائی کرنی چاہیے۔ بادشاہ نے ہر چند بیماری کا بہانہ کیا، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔

میں بھی سکرتال گیا

اس تقریب سے میں بھی شاہی لشکر کے ہمراہ (رائے بہادر سنگھ کی معیت میں) اس طرف روانہ ہوا۔ ان لوگوں نے جا کر ضابطہ[1] خاں کو بغیر جنگ کے (ہی) بھگا دیا، اور اس کے اموال و اسباب اور جائداد پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہ کو سوائے دو[2] سو مریل گھوڑوں اور چند پھٹے پرانے خیموں کے کچھ نہ دیا۔ باشاہ (مرہٹوں کی) اس حرکت سے بہت بد دل ہوا۔ لیکن کیا کرتا؟ دھنیوں کے پاس طاقت تھی اور یہاں نہ زور تھا نہ زر۔ جب ان مرہٹوں پر زور نہ چلا تو کار پردازوں نے یہاں (اس کے) لوگوں کی جاگیریں دھڑا دھڑ ضبط کرنا شروع کر دیں اور بہت سے انسانوں کو ذلیل و خوار کیا۔

---

[1] ضابطہ خاں، امیر الامرا نجیب الدولہ کا فرزند تھا۔ اور نجیب الدولہ کی وفات (۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء) کے بعد اُس کی جگہ دربارِ شاہی میں منصب دار ہوا تھا لیکن کچھ الزامات لگا کر اسے نکال دیا گیا اور املاک ضبط ہو گئیں۔ اُس نے سرکشی کی تو شاہ عالم نے مرہٹوں کی امداد سے سکرتال میں فوج کشی کر کے دبا لیا۔ (۱۱۸۵ھ) سہارن پور اور نجیب آباد کے علاقے اس کے تحت میں تھے۔ ۱۷۸۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اور اُس کا لڑکا غلام قادر خاں روہیلہ جانشین ہوا۔ یہ وہی غلام قادر ہے جس نے آگے چل کر شاہ عالم کو نورِ بینائی سے محروم کیا۔ (ن۔ا۔ف)

وجیہہ الدولہ سے وظیفہ

(اِسی باعث رائے بہادر سنگھ میں بھی استطاعت نہ رہی) میں (بھی) گدائی کے لیے اُٹھا اور لشکر شاہی کے ہر سردار کے در پر گیا چونکہ شاعری کے سبب سے میری شہرت بہت تھی۔ لوگ گونہ عنایات میرے حال پر مبذول کرتے تھے، بارے (ان کی تھوڑی امداد سے) کٹتے بٹی کی ایسی زندگی گزارتا رہا۔ اور حسام الدولہ کے چھوٹے بھائی وجیہہ الدین خاں سے ملاقات کی، اس شخص نے میری شہرت اور اپنی اہلیت پر نظر کر کے بہت تھوڑا سا (وظیفہ) مقرر کر دیا، (مگر) دل دہی بہت زیادہ کی۔

شاہ عالم اور مرہٹوں کی جنگ

القصہ چونکہ بادشاہ دکھنی سرداروں کی سرکشی سے ناخوش تھا اُن کی مرضی کے بغیر شہر (کی طرف) روانہ ہوا اور قلعے میں آگیا، یہاں آکر نجف خاں نے جو خود کو لشکرِ شاہی میں سپاہی سمجھتا تھا، بے سوچے سمجھے بادشاہ کو اِس پر آمادہ کر لیا کہ جاٹوں کے مقبوضہ محالات کو ہتھیا لیا جائے۔ آخر اس نے حسام الدولہ سے جو دکھنی سرداروں سے گہرے تعلقات رکھتے تھے، مشورہ کیے بغیر، اس عظیم کام کی اجازت حاصل کر لی۔ دس پندرہ ہزار قلاش لوگ شہر اور بیرونجات سے جمع کیے اور یہ مہم شروع کر کے شہر سے نزدیک کے بارہ محالات پر قبضہ کر لیا۔ (لیکن) چونکہ نو عمر اور ناتجربہ کار تھا، (اس لیے) کچھ احمقوں اور ناعاقبت اندیشوں کے پٹی پڑھانے سے (بہک گیا اور) وہاں سے ہٹ کر دکھنیوں سے جنگ کرنے میں لگ گیا۔

مرہٹوں کا منصوبہ

اُنھوں (مرہٹوں) نے آپس میں مشورہ کیا کہ آج تو بادشاہ فقیروں کی طرح (بے سروساماں) ہے۔ اور بایں زور و طاقت

ہم سے لڑنے چلا ہے، اگر واقعی اسے طاقت حاصل ہو گئی۔ تب تو ہمارا ناک میں دم کر دے گا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم دوآبے سے (نکل کر) شہر کی طرف جائیں اور اُسے (اتنی) مہلت دیے بغیر (اس کا) کام (ہی) تمام کر دیں۔ اگر وہ جنگ میں میدان چھوڑ جائے تو خیر، ورنہ اسے ہرا کر اُس کی فوج کو پراگندہ کر دیں اور خود اُسے فقیروں جیسے حال میں چھوڑ دیں کہ وہ نان و نمک کھا کر جیتا رہے اور ہمارا دست نگر بنا رہے۔ جب یہ مشورہ ہو گیا (تو) ضابطہ خاں (پسر نجیب الدولہ) سے بخشی گری (کے منصب) اور سہارن پور (کی جائداد بحال کرنے) کا جو اُس کے قبضے سے چھین کر بادشاہ کے علاقے میں شامل کر لی گئی تھی۔ وعدہ کر کے اُسے خوش کیا، اور اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور جاٹوں کی فوج کو بھی اِسی ڈھب سے ہموار کیا پھر ایسی ہڑبونگ کرتے ہوئے (جس کا نہ لکھنا ہی بہتر ہے) دوآبے سے نکل کر، ایک ہفتے کے اندر فرید آباد کے نزدیک پہنچے اور دریا کو عبور کر لیا جو پایاب تھا، دو تین روز جھڑپیں رہیں، آخر ایک دن (باقاعدہ) جنگ چھڑ گئی۔ اِس طرف سے نجف خاں نے اور دلیو چان (موسیٰ مدک فرنگی نے جو نجف خاں کے اِغوا کرنے سے جاٹ (سورج مل) کی ملازمت چھوڑ کر اس شامت کی ماری فوج میں شامل ہو گئے تھے، میدان جنگ میں بہادری دکھائی۔ نمک حرام مغلوں نے جب دشمن فوج کو دیکھا (تو ڈر گئے)، پیٹھ دکھا کر بھاگے اور رسوا ہوئے۔ کچھ اجل رسیدہ اور بے دست و پا لوگ، مفت میں زخموں سے چور چور ہو کر مر گئے۔ میدان صاف دیکھ کر فوج کا ایک دستہ بے تکلف شہر میں گھس آیا، شاہی ہاتھی اور بہت سا اسباب اپنے ساتھ لے گیا۔ کچھ حواس باختہ لوگ جو (وہاں) جمع ہو گئے تھے، چشم زدن میں میدان چھوڑ بھاگے ایک گھڑی رات گئے تک حسام الدین خاں

معدودے چند (سپاہیوں) کے ساتھ ریتی (کے میدان) میں جما رہا، پھر (وہاں سے) اُکھڑ کر بادشاہ کے پاس گیا، اور آدھی رات کے قریب نجف خاں اور چند دوسرے مظلوموں کو موت کے منھ میں چھوڑ کے اپنی حویلی میں داخل ہو گیا۔ پُرانا شہر جس میں کہیں کہیں آبادی تھی اس حادثے میں از سرِ نو لوٹا گیا۔ ہم غریبوں کو حافظِ حقیقی نے اپنی حفاظت میں رکھا، صبح اِدھر کے بہادروں میں مقاومت کی تاب نہ تھی، جو میدان میں نکلتے، شہر پناہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ مورچال درست کر کے توپ کی جنگ کرنے میں سارا دن گزار دیا۔ بادشاہی اقبال نے کام کیا، ورنہ (وہ لوگ) قلعہ مبارک بھی اُڑا دیتے اِدھر کے لوگوں کا سلیقۂ جنگ اور استعداد تو اُسی دن معلوم ہو گئی تھی جب دکھنیوں کی فوج کی آمد آمد ہوئی تھی، بہتوں کے ہوش اُڑ گئے اور توپ خانے کے لوگوں نے جنگی سامان مثلاً توپ در ہکلہ، دجزائر افتادہ، وسرب، دباروت دبان دغیرہ کے لیے حضورِ اقدس میں عرض کیا۔ متصدیوں نے میر آتش کو، جو برف سے بھی ٹھنڈا ہے، صرف سَو روپے دیے۔ اُس کا چہرہ اور اس کی مونچھیں اگر دیکھو تو مغالطہ ہو کہ مرد ایسے (ہی) ہوتے ہیں! (مگر وہ بزدل) ایسا کونے میں دبکا کہ جب تک لڑائی ہوتی رہی اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ آخر تیسرے دن حسام الدولہ سوار ہو کر گئے اور اُن کے حسبِ منشا صلح کر کے (واپس) آئے۔ بارے نیا شہر محفوظ رہا۔ اب دکھنی (سردار) مختار کے اشارے پر نجف خاں اور نمک حرام مغلوں کو نکالنے کی فکر میں ہیں۔ دیکھتا ہوں کیا صورت ہوتی ہے۔ یہ پھٹکارے ہوئے لوگ کس طرح شہر سے نکلتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں!

القصہ، سندھیا جو دکھنیوں کا تیسرا سردار تھا، جے پور کی طرف گیا، اور سردار

دریا کے اُس پار جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ غالب (خیال) ہے کہ (وہ) فرخ آباد کے راستے سے جھانسی جائیں اور وہاں شجاع الدولہ کے ملک کی خرابی کا سبب بنیں۔

نجف خاں کا اِخراج

(سانحہ) چونکہ عام طور پر شہر کے لوگوں کی زبانوں پر تھا کہ نجف خاں وغیرہ سردار اور شورہ پشت مغل، تنخواہ کا مطالبہ کرنے کی سوچ رہے ہیں اور جیسے ہی مرہٹے چلے جائیں گے یہ جمِ غفیر بادشاہ کے دروازے پر دھرنا دے کر متقدیوں کو پریشان کرے گا اور اپنا روپیہ مانگے گا۔ لہٰذا حسام الدولہ نے (جو مختار تھے) دکھنیوں سے کہا کہ یہ لوگ نمک حرام اور دنگئی ہیں جس طرح بھی سمجھ میں آئے اُنھیں رگیدنے کی فکر کرو۔ اب اُن (نوابِ مذکور) کے اشارے پر مرہٹہ سردار اِس قوم کو شہر سے نکالنے کے درپے ہے۔ چنانچہ یہ تاکید کردی گئی ہے کہ کوئی مغل شہر میں نہ رہے۔ جب اس بات نے طول پکڑا، اور شاہی متقدی قلعے میں جا کر بیٹھ رہے۔ اور شہر کے لوگوں کو بند کر دیا، بظاہر تو اس بے حقیقت گروہ نے لاہوری دروازے تک مورچے باندھ کر، فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی اور باطن میں دکھنیوں سے جیتنے کی طاقت نہ دیکھی تو اُن سے سانٹھ گانٹھ کرلی۔ جب ہنگامہ آرائی سے کام نہ بنا اور دیکھا کہ مقابلہ کرنے میں ہم مارے جائیں گے تو ناچار (شہر سے) نکلنے پر رضامند ہوگئے، اور مرہٹوں سے عہد و پیمان کیے۔ دو تین روز کے بعد نجف خاں اور دوسرے مغل سردار اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اُن کے لشکر میں گئے، تو دکھنیوں نے جو ظاہری سلوک اور مراعات کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کرتے، اِس نابکار گروہ کی عزت کرنے میں کوتاہی نہیں کی لیکن وہ عزت جو بادشاہی نوکری میں تھی (یہاں ہونا) معلوم! کچھ دنوں میں یہ

بے حقیقت جماعت پراگندہ ہو جائے گی (اور) ہر شخص کسی (نہ کسی) طرف چلا جائے گا۔ مشہور یہی ہے کہ مرہٹے بالفعل ان سب لوگوں کو اکبر آباد تک اپنے ساتھ لے جائیں گے اور وہاں سے اجازت دے دیں گے کہ جو جہاں جانا چاہے چلا جائے۔

حاصل یہ کہ شرارت پیشہ مغل اور سراپا فساد مرہٹے قریب ہے کہ چلے جائیں اور حضرت ظلِ سبحانی، اپنی ذات قدسی صفات (اور) دو تین محرّروں کے ساتھ بغیر کسی تشویش کے قلعۂ مبارک میں تشریف رکھیں۔ اگر دن میں سو بار (بھی) قلعے کے کنگرے کنگرے پر سیر کے لیے آئیں تو کون ہے جس کا حجاب مانع ہو؟ اور اگر بازار میں پیدل نکل آئیں تو حاجب کہاں (ہیں)؟ جو دور باش کہیں! ڈھنگ ایسا نظر آتا ہے کہ اہلِ حرفہ سر بصحرا نکل جائیں (گے)، اور سپاہی پیشہ (لوگ) بھیک کے لیے ہاتھ پھیلاتے پھریں گے۔ ہر شخص اپنا رستہ لے گا۔ شہر بڑا بارونق ہو جائے گا!

حسام الدین خاں کا حشر

(سانحہ) تازہ یہ (ہوا) کہ جب دکھنیوں نے نجف خاں کو ساتھ لے کر دریا کے اُس پار جانے کا قصد کیا تو نصرانیوں کی مدد لے کر وزیر حال (شجاع الدولہ) یلغار کرتا ہوا اپنے صوبے (اودھ) سے فرخ آباد تک آگیا اور (مرہٹوں کے) مقابل ہوا۔ چونکہ دکھنی (فوج کے سرداروں) نے خود کو اِس موقف میں نہیں دیکھا کہ ان کا مقابلہ کر سکیں، قریب تین مہینے قیل و قال میں گزار کر صلح کے خواہاں ہوئے۔ وزیر بھی فی الواقع بہادر تھا، (اس نے صلح کی پیش کش کو) غنیمت جانا اور قبول کر لیا۔ آخر کار نجف خاں کو شاہی مختار کار بنا کر اپنے صوبے کو روانہ ہو گیا۔ دکھنی اور پوربی بھی اپنا معاملہ اُسے سونپ کر اپنے اپنے مقبوضہ علاقوں میں چلے گئے۔ جب نجف خاں شہر میں داخل ہوا (تو) حسام الدولہ

کا رنگ فق ہو گیا۔ دو تین روز گھر میں (دبکا) بیٹھا رہا، اس کے بعد بادشاہ نے قلعے میں بلا کر اپنے چند سالہ حساب کے کاغذات طلب کیے اور اُسے وہیں نگرانی میں رکھا۔ امجد الدولہ عبد الاحد خاں پسر عبد المجید خاں مغفور نے جو خاص شاہی کار پردازوں میں سے تھا، راجا ناگر مل کی تبدیلی کے بعد، دیوانی خالصہ کا خلعت پہنا اور شاہی مختار کار ہو گیا۔ آخر کار بادشاہ نے حسام الدین خاں کو جو مختار الملک تھا، قید کر لیا۔ (پھر) زر شاہی اور مغلوں کی تن خواہ کے لیے آٹھ لاکھ[1] رُپے کے عوض فتح خاں دُرانی وغیرہ کے حوالے کر دیا۔ وہ اُسے قلعے سے اپنے گھر لے گیا۔ اب مغل مختار ہیں، چاہیں مار ڈالیں، چاہیں (زندہ) چھوڑ دیں۔ ع

این شامتِ اعمال قیامت بسر آورد

جاٹوں سے جنگ

(سانحہ) عبد الاحد خاں جو دیوان خالصہ ہو گیا تھا، (اس نے) بادشاہ کے مزاج میں پورا دخل کر لیا تھا، اب مختار بن گیا، جو جی میں آتا کرتا تھا، کسی کو چوں کرنے کی مجال نہ تھی۔ شاہی فوج کا حال پتلا (تھا)، بادشاہ کمزور (تھا)، شہر اور چند دیہات (اس کے تصرّف میں رہ گئے تھے اُن) پر گزارا کرنا کیسے ممکن تھا؟ جاٹ، یعنی سورج مل کی اولاد درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی تک قابض ہو چکے تھے جو شہر سے تین چار کوس پرے ہے۔ نجف خاں نے بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ "حضرت زندگی یوں (گزارنا)، تو ظاہر ہے (کہ بے مزہ ہے) اگر یہ ملک جو جاٹ کے قبضے میں ہے ہاتھ آجائے۔ تو اطمینان نصیب ہو سکتا ہے" بادشاہ نے جواب دیا "شاید تم

---

[1] متن میں "بعوض ہشت صد لک روپیہ" ہے، لیکن "ہشت لک" ہونا چاہیے۔ (ن ۔ ا ۔ ف)

خواب دیکھتے ہو، چھوٹے منھ سے بڑی بات کرنا کیا ضرور ہے!" وہ بولا: "اگر ایسا ہو جائے تو حضرت مجھے کیا دیں گے؟" بادشاہ نے کہا: "ملک مفتوحہ میں سے تیسرا حصہ میں لے لوں گا باقی سب تمھارا!" چوں کہ اس (جاٹ) قوم کی شامت قریب تھی، ایک دن اُن کی فوج گڑھی کے میدان میں آگئی، جو درگاہ خواجہ مسطور علیہ الرحمہ کے نزدیک ہی ہے، اور وہاں دھما چوکڑی مچانے لگی۔ نجف خاں (اپنے) لوگوں کو، جن کے پاس ڈھنگ کا سامان بھی نہ تھا لے کر اُن پر یک لخت حملہ آور ہوا۔ وہ (جاٹ) بہت مغرور ہو چلے تھے، اُنھیں خاطر میں نہ لائے اور بے پروائی ظاہر کی، (مگر) جب جنگ چھڑی تو ایسا پانسا پلٹا جس کا (وہ لوگ) تصوّر بھی نہیں کر سکتے (تھے) یعنی شام تک اُنھوں نے میدان جیت لیا اور شاہی فوج کے آدمی رات کو کچّا غلّہ کھا کھا کر وہیں پڑ رہے اور خوب خوشیاں منائیں۔ اگلی صبح کو آگے بڑھے اور بلّم گڑھ کا محاصرہ کر لیا جو شہر سے بارہ کوس کے فاصلے پر اُن (جاٹوں) کا بڑا مضبوط قلعہ تھا۔ چند روز تک توپ اور رہکلے کی جنگ ہوتی رہی۔ وہاں کے سردار نے کہا کہ (صرف) قلعے پر قبضہ کر لینے سے جاٹوں کی جنگ کا خاتمہ نہیں ہو گا، آگے جاؤ اور بڑے سرداروں سے جو جنگ (در پیش) ہے اُسے نمٹاؤ، یہ قلعہ (تو) میں بغیر جنگ کے خالی کر کے (تمھیں) دے دوں گا۔ نجف خاں اس چھوٹی عمر کے باوجود بات کو سمجھنے والا سردار تھا، اُس قلعے سے ہاتھ اُٹھا کر، اور اُسی سردار کو وہاں چھوڑ کر، آگے بڑھ گیا۔ جب ہوڈل کے قریب پہنچا جو جاٹوں کا مقبوضہ قصبہ تھا تو (ایک اور) مشکل پیش آئی یعنی اُدھر سے بھاری فوج آئی اور مقابلے میں ڈٹ گئی۔ یہ بڑی مہم سر پر آ پڑی، جاٹوں کا سردار، جس کا نام

نول سنگھ تھا بھاری لاؤ لشکر اور بڑے توپ خانے کے ساتھ آکر مقابل ہوا۔ جنگ کا ہنگامہ ہوا اور آسمان نے بہتوں کو خاک و خون میں لٹا دیا۔ رفتہ رفتہ زمین تنگ ہونے لگی اور رسد کی کمی سے شاہی فوج کے لوگ بھوکوں مرنے لگے تو انھوں نے زندگی سے ہاتھ دھوکر، لڑنا مرنا شروع کیا مگر سختی اُٹھائی اور مارے گئے۔ چوں کہ اُس قوم کی شامت سے (ان کی) فتح ہونی تھی، (اِدھر کے) سرداروں نے پیادہ ہوکر (لڑنا شروع کیا اور) میدان مار لیا۔ وہ بھاری لاؤ لشکر شکست کھا کر واپس ہوگیا۔

نجف خاں جیت گیا

سمرو نام کا فرنگی، جو اُدھر کے توپ اور رہکلے کر بڑی جرأت کے ساتھ دیر تک جم کر کھڑا رہا تھا۔ آخری دن وہ بھی بھاگ گیا۔ نجف خاں، جس کی سرکردگی میں یہ عظیم کارنامہ انجام پایا تھا، بڑا فخر کرتا تھا۔ جس نے بھی یہ ماجرا سنا، نہایت متعجب ہوا۔ جاٹوں کا سردار اپنے قلعے میں جاکر بیمار پڑ گیا۔ یہاں نجف خاں کے گرد بہت لوگ جمع ہوگئے وہ بڑا رئیس ہوگیا۔ چوں کہ دولت نہیں رکھتا تھا، اس لیے زبانی جمع خرچ کر کے کام نکالتا رہا، جو کوئی آتا، نوکر ہو جاتا، چند ہی روز میں دریائے بے کراں کی طرح وسیع لشکر جمع ہوگیا، یہ اگرچہ مفلس تھا مگر چرب زبانی سے اپنا کام نکال رہا تھا۔ جب دیکھا کہ اِن طفل تسلیوں سے فوج نہیں رہ سکتی تو ہمت کر کے سرداروں کو جاٹوں کے محالات پر بھیجنا شروع کر دیا۔ بارے یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ خود اس نے ڈیگ کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ جو وہاں سے بارہ کوس پر تھا۔ اتفاق سے وہاں کا سردار جو بیمار تھا مر گیا۔ انھوں (جاٹوں) نے سورج مل کے

چوتھے بیٹے رنجیت سنگھ کو لے کر جنگ کرنا شروع کیا۔ اُس قلعے کے داروغہ توپ خانہ نے اِدھر کے سرداروں سے سازش کر لی اور قلعے میں گھسنے کا راستہ بتا دیا، (یہ) لوگ یورش کر کے اندر گھس گئے اور شہر کی لوٹ مار کر کے بہت فائدہ اُٹھایا۔ ہر بے حیثیت کو بڑا ساز و سامان ہاتھ آیا، بہت سا اسباب اور بے شمار توپ خانہ نجف خاں کو بھی ملا۔ اس فوج کے پیادے مال دار ہو گئے (اور) سات آٹھ دن کی لوٹ مار کے بعد وہ قلعہ سردار کے حوالے کر کے آگے کوچ کیا۔ اب کمھیر کا قصد کیا جو اُس کا دوسرا قلعہ تھا۔ رنجیت جو اُس قوم کا سردار ہو گیا تھا، (اُس) قلعے کو خالی کر کے اور آلاتِ جنگ سمیٹ کر بھرت پور چلا گیا، جو ایک مضبوط قلعہ ہے۔ یہ (لوگ) اُس شہر پر بھی قابض ہو گئے۔ اور بہت سا مال سپاہیوں کے ہاتھ آیا۔ مجبور ہو کر جاٹوں نے صلح کا پیغام دیا، کشوری جو رنجیت سنگھ کی ماں ہے، اور شعور سے بہرہ رکھتی تھی (خود) آئی اور صلح کی خواہش ظاہر کی۔ بھرت پور انھیں دے کر اور اس مہم کو پھر کسی وقت کے لیے ملتوی کر کے نجف خاں آگرے آ گیا، جو ایک مضبوط راجدھانی ہے اور جاٹ اُس پر قابض تھے، اور یہاں کے قلعے کی جنگ میں لگ گیا۔ چوں کہ اقبال یاور تھا، تھوڑی سی مدت میں نقب لگا کر اُس پر بھی قبضہ کر لیا۔ جو سردار جاٹوں کی طرف سے اُس (قلعے) میں رہتا تھا اُسے وعدہ وعید دے کر نکال دیا اور وہاں کے لوگوں سے سلوک کیا، (اس طرح) تمام صوبے پر قابض ہو گیا۔ جسے چاہتا تھا وہاں کے محالات تن خواہ میں (مقرر کر) دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اُس تمام ملک کا مالک ہو گیا۔ (اُدھر کے) سب راجوں اور زمینداروں کے کان کھڑے ہو گئے۔ (اب) اگر جاٹ کچھ گڑبڑ کرتے تو ایسی منھ کی کھاتے کہ پھر اِدھر کا

رُخ نہ کرتے۔

جب نجف خاں اِس تمام ملک کا مالک ہو گیا اور اُسے کامیابی نصیب ہو گئی تو عبد الاحد خاں کے سامنے دُوْن کی لینے لگا یعنی سلطنت کا مدار ہی اب اُس کی ذات سے وابستہ ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے اُس کے قول کے مطابق ملک کے تیسرے حصّے کا سوال کیا (تو) اُس نے حضور میں آکر عرض کیا کہ یہ ساری فوج جو میرے ساتھ ہے، ملک بطور تن خواہ میں نے اُس کے آدمیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حضرت مجھ سے تیسرے حصّہ ملک کی قیمت لے لیں۔ بادشاہ کو اُس کے جھوٹے وعدوں پر اطمینان نہ تھا، کہنے لگا: "اتنا ملک چھوڑ دینا چاہیے۔" عبد الاحد خاں کی زور آوری کے سامنے اُس کی یہ قلا بازیاں نہ چل سکیں، ناچار ملک کے تیسرے حصّے کے محالات بطور مختار علیحدہ کر کے دے دیے۔ اور اُسے میر بخشی گری کا خلعت عطا ہوا امیر الامرا ہو گیا۔ کچھ دن کے بعد (بادشاہ کے) حضور سے اجازت لے کر اکبر آباد (آگرہ) چلا گیا۔

عبد الاحد خاں اور سِکھ

یہاں عبد الاحد خاں نے سکھوں کو (اپنے ساتھ) ملا لیا اور جتنا (مال و منال) بن پڑا اُنھیں دیا۔ پھر اس بھاری فوج کے بھرّے پر شہزادہ فرخندہ اختر کو لے کر راجا پٹیالہ پر حملہ کر دیا۔ اُس کا ارادہ یہ تھا کہ موقع ملے تو سکھوں کو نجف خاں سے بھڑا دے۔ اُدھر (پٹیالے کی طرف) جا رہا تھا مگر خیال اِدھر (نجف خاں) ہی کا تھا۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بہت سے لوگ امیر الامرا کے لشکر سے علیحدہ ہو کر (عبد الاحد خاں) مختار کے نوکر ہو گئے۔ مگر یہ ملک داری اور ریاست کے معاملات سے نا بلد تھا، ہر کام

اُدھورا چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ دنوں تو جما رہا پھر سکھوں کے مشورے سے راجا (پٹیالہ) سے صلح کر لی۔ جو کچھ جمع پونجی تھی وہ یوُں ختم ہو گئی (تو) اب بادشاہ سے کچھ طلب کیا۔ بادشاہ اُس کے رُپیہ مانگنے سے بہت بد دل ہوا، اور لکھ بھیجا کہ جو کچھ ہونا ہے ہو رہے، میرے پاس تو رُپیہ ہے نہیں!

حافظ رحمت خاں کی شہادت

(سانحہ) وزیر اعظم، امیر معظم شجاع الدولہ جو بہت زور آور تھا، حافظ رحمت خاں روہیلہ سے جنگ کرنے نکلا۔ اِن دونوں کی آپس میں بہت کٹی چھنی تھی۔ حریف (رحمت خاں) نے ازراہِ بد اندیشی انگریزوں کو لکھ بھیجا کہ: "وزیر (شجاع الدولہ) جو اتنی فوج اکٹھی کر رہا ہے وہ تمھاری پرخاش میں ہے۔" چناں چہ گورنر بہادر مقابلے کے لیے نکل آیا۔ نواب وزیر جو اِس بالا دست قوم (انگریز) سے بہت ہی رعایت اور لحاظ کرتا تھا، اُن کے پاس اکیلا گیا اور کہا: "میں تمھارا پاس کرتا ہوں اور کسی سے اپنی بات ہیٹی نہیں کروں گا۔ اِس میں جو کچھ ہونا ہے ہو رہے! چاہے مجھے اپنے ساتھ کلکتے لے جاؤ یا ملک کو میرے اوپر چھوڑ دو۔" انگریزوں نے وزیر کے سلوک پر نظر کر کے سب چیزوں سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ کڑا اور الہ آباد بھی اُس کے حوالے کر دیے، اور چلے گئے۔ جب آسمان نے نیا شگوفہ کھلایا اور زمانہ نیا ہی انقلاب لایا۔

جب وزیر وہاں سے پلٹا تو اُس کے لشکر میں بہت سے فرنگی مقدمۃ الجیش تھے اور اپنے طور پر جنگ کی ٹھانے ہوئے تھے۔ جب روہیلوں نے یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا لشکر دیکھا تو سہم گئے اور ضابطہ خاں وغیرہ دوسرے سرداروں نے دس بارہ ہزار کی جمعیت کے ساتھ آ کر اظہارِ اطاعت کیا کہ ہم تو دولت خواہ اور مطیع و منقاد ہیں،

سرتابی نہیں کریں گے۔ وزیراعظم نے خدا کے فضل و کرم پر نظر کر کے حکم دیا کہ (ہماری) فوج کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ۔ بعض سرداروں نے کہا بھی کہ "یہ قوم غدار ہے، اس پر بھروسا نہ کرنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ عین جنگ کے موقع پر گڑبڑ کرے"۔ مگر وزیر بھی بہادر تھا اُس نے بے دماغی سے جواب دیا: "مجھے ان کا زور معلوم ہے، چٹکیوں میں مسل دوں گا!"

صاحب زادہ آصف الدولہ بہادر جو اب وزیراعظم ہیں، جنگ کے میدان میں بڑی سرگرمی سے لڑے، جدھر کا رُخ کرتے دُھواں سا اُڑا دیتے، اور توپ خانے کے زنجیرے کو تلوار سے کاٹ دیتے۔ جب جنگ اپنے شباب پر آئی ہے تو حریف کی ساری اکڑفوں ہوا ہو گئی۔ (ادھر سے) اتنے گولے برسائے گئے کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ جب زمین (رحمت خاں پر) تنگ ہو گئی اور اُس نے دیکھا کہ نہ بھاگنے کا راستہ ہے نہ ٹکنے کا موقع تو دل کڑا کر کے میدان میں جم گیا اور دنیا سے دل ہٹا کر جان پر کھیل گیا۔ ایک ہی ہلے میں روہیلوں کے ہوش و حواس اُڑ گئے، جانوں پر بن گئی، بڑے بڑے دلاوروں کے پتّے پانی ہو گئے۔ ایک گولا اُس (حافظ رحمت خاں) کے سینے پر لگا۔ صفیں درہم برہم ہو گئیں اور دشمن کا سر گیند کی طرح لڑھک گیا۔ جب اُسے اس لشکر میں لا کر دکھایا تو روہیلوں نے تصدیق کی کہ ہر عمل کی جزا اور ہر کرتوت کی سزا (ضرور ملتی) ہے۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ (حافظ رحمت خاں) مارا گیا[1]

---

[1] ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو کڑہ میران پور کے میدان میں حافظ رحمت خاں شہید ہوئے۔ وہ اُس انحطاطی دور میں ایک ایسے جری، باہمت، اور پاک باطن سردار تھے کہ اگر شجاع الدولہ اور انگریز اُن کے ساتھ غدّاری اور نمک حرامی نہ کرتے تو اُنھوں نے تاریخ ہندستان میں یقیناً کوئی عظیم انقلاب برپا کر دیا ہوتا۔ لیکن نوابانِ اودھ کے خاندان کا دامن محسن کشی

تو وزیر نے اِس فتح کے شکرانے میں سجدہ کیا۔ (حریف کا) لشکر لٹ گیا، بہت سے سردار قید کر لیے گئے" اور اُس کا سارا ملک وزیر (شجاع الدولہ) کے قبضے میں آگیا۔ نجف خاں جو آگرے سے آکر اِس جنگ میں وزیر کے لشکر میں شامل ہوا تھا، رخصت لے کر پھر آگرے چلا گیا۔

میری خانہ نشینی

فقیر (میر) اُن دنوں خانہ نشین تھا۔ بادشاہ نے اکثر طلب کیا، مگر نہیں گیا۔ عبدالاحد خاں مختار کا چچیرا بھائی اور ابوالبرکات خاں صوبہ دار کشمیر کا لڑکا ابوالقاسم خاں میرے ساتھ بہت سلوک کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس سے ملاقات ہو جاتی تھی، بادشاہ بھی گاہے گاہے کچھ بھیج دیتے تھے۔ ؎

مصرع گاہ گاہ می گویم

کارِ دنیاے من ہمیں قدر است

شجاع الدولہ کی وفات

اِس فتح عظیم کے بعد وزیر اعظم امیرِ معظم نواب شجاع الدولہ بڑی شان و شوکت سے (اپنے)

(بقیہ) طمع و آز اور بد اعمالیوں کی سیاہی سے ہمیشہ داغ دار رہا ہے۔ چناں چہ شجاع الدولہ کی بد باطنی نے اپنے ہی نہیں اپنے باپ کے بھی اس محسن کو پوری طاقت سے کچل کر روہیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا اور روہیلوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے کمزور کر دیا۔

حافظ رحمت خاں کا مقبرہ بریلی میں موجود ہے۔ ان پر مزید مطالعے کے لیے ملاحظہ ہوں۔
(۱) اخبار الصنادید، مولفہ نجم الغنی رامپوری جلد دوم مطبع نولکشور ۱۹۱۸ء (۲) تاریخ اودھ، حصہ دوم مولفہ نجم الغنی رامپوری، مطبع نولکشور ۱۹۱۹ء (۳) حیات حافظ رحمت خاں، مولفہ الطاف علی بریلوی، نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۳ء (۴) گلستان رحمت، مصنفہ نواب مستجاب خان بہادر خلف حافظ رحمت خاں، (انگریزی ترجمہ از چارلس ایلیٹ طبع ۱۸۳۱ء طبع لندن)۔ وغیرہ۔

صوبے میں داخل ہوا۔ لیکن آسمان کی نظر تو اہلِ دنیا کی خرابی پر لگی رہتی ہے، اِس انبوہِ پُرشکوہ کو بھی نظر کھا گئی، یعنی وہ بہادر اور لائق وزیر آب و ہوا کی تبدیلی سے ایسا بیمار پڑا کہ مرض کا تدارک مشکل ہو گیا۔ بہت سے طبیبوں اور فرنگیوں نے معالجے میں کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ (وزیر نے) جب دیکھا کہ بیماری بڑھتی ہی جا رہی ہے تو از راہِ دانش مندی اپنے خلف الصدق نواب آصف الدولہ بہادر کو مسندِ وزارت پر بٹھا دیا جو نہایت شائستہ کار، جری، سخی، فیاض، رحم دل اور غریب پرور ہیں۔ پھر اس دنیا سے کنارا کر گئے[1] نواب کے ماتم میں سارا عالم سیاہ پوش ہو گیا۔ یہ حادثہ بڑا سخت ہوا۔ اگر آسمان ہزار سال گھومتا رہے تب کہیں ایسا ہمہ تن جرات اور سراپا مروّت سردار پیدا ہوتا ہے۔

مختار الدولہ کی وفات

کچھ دنوں کے بعد مختار الدولہ بھی جس کے ہاتھ میں صوبہ داری اور وزارت کی ذمہ داریاں تھی۔ بسنت نامی خواجہ سرا کے ہاتھوں مارا گیا، اور عدم کو سدھارا۔ اب نیابت کا عہدہ حسن رضا خاں سرفراز الدولہ کو ملا۔ یہ ایک سنجیدہ، متواضع، خلیق اور اوصافِ حمیدہ کا مالک سردار ہے، صفتِ کرم اس کی تمام صفات پر غالب ہے۔ اور حسن سلوک سے وضیع و شریف لوگوں کی دل جوئی کرتا ہے۔ اُس کی عنایتیں میرے ہی حال پر نہیں بہتوں پر ہیں، خدا اُسے سلامت رکھے۔

---

[1] شجاع الدولہ کی وفات "۲۳. ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ روز پنجشنبہ کو چار گھڑی رات باقی رہے" پر ہوئی۔
(تاریخ اودھ: ۲ / ۲۹۴، بحوالہ تاریخ فرح بخش)

(سانحہ) مختار (عبدالاحد خاں) کے رُپیہ طلب کرنے سے بادشاہ کڑھا تو بیٹھا ہی تھا۔ اُس نے ذوالفقار الدولہ (نجف خاں) کو لکھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہاں پہنچو۔ بادشاہ کی شہ پا کر وہ دلیرانہ (وہاں سے) روانہ ہوا عبدالاحد خاں یہ خبر سُنتے ہی کہ امیر الامرا (نجف خاں) آرہا ہے، نہایت بدحواسی میں بادشاہ زادہ اور سکھوں کی فوج کو ساتھ لے کر بھاگم بھاگ آیا اور نجف خاں کے شہر میں داخل ہونے سے دو دن پہلے قلعے کا بندوبست اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھ رہا۔

نجف خاں کا زمانہ

جب یہ شور ہوا کہ ذوالفقار الدولہ آگیا، تو بادشاہ نے اُسی مختار (عبدالاحد خاں) سے استقبال کو جانے کے لیے کہا یہ بڑے تزک و احتشام سے گیا اور ملاقات کی۔ سوار ہوتے وقت دونوں ایک ہی ہاتھی پر بیٹھے۔ نجف خاں نے عبدالاحد خاں کو منافق جان کر ظاہر داری کا برتاؤ کیا اور قلعے کے دروازے تک میٹھی باتوں میں لگا کر لے آیا۔ یہاں آکر اپنے آدمیوں کو اشارا کر دیا کہ میری توپ، رہکلہ اور فوجیں قلعے کے اندر بے تحاشا گھس جائیں اور جگہ جگہ کھڑی ہو جائیں۔ ہرچند اِن دونوں کے درمیان صرف ایک چاقو کے پھل کا فاصلہ تھا اگر (نجف خاں) چاہتا تو ایک ہی وار میں مختار کا کام تمام کر دیتا لیکن بادشاہ کی بندگی کا خیال رہا کہ آخر یہ بھی حضور کا ملازم ہے۔ پہلے بادشاہ کی مرضی معلوم کر لینی چاہیے پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ جب اِس ہنگامے کے ساتھ بادشاہ کے سامنے آیا اور ملازم ہوا تو دیکھا کہ بادشاہ مطمئن ہے اور اُسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ تو وہاں سے نکل کر بیچ بازار

میں آکھڑا ہوا اور عرض بھیجی کہ میں نے تو حضور کا خیال کر کے دست اندازی نہیں کی تھی، اب جب تک عبدالاحد خاں کو ساتھ نہ لے لوں یہاں سے نہ ٹلوں گا۔ بادشاہ نے ظاہر میں تو بات چیت کی لیکن خفیہ طور سے یہی کہا کہ جس طرح بن پڑے اِسے (یہاں سے) لے جاؤ۔ چوں کہ مختار کے سپاہی مجبور ہو کر جا چکے تھے اور سکھ بھی الگ تھلگ ہو گئے۔ ناچار ہو کر اُس نے قول و قسم لیے کہ نجف خاں میرے ساتھ زیادتی نہ کرے اور میری عزت کے درپے نہ ہو، بادشاہ نے کہا: ''میں تمہارا ضامن ہوں، بے اندیشہ چلے جاؤ۔'' جب کوئی اور راستہ نہ دیکھا اور زمانے کی نظریں بھی بدلی ہوئی پائیں تو شام کے وقت ایک ہاتھی پر سوار ہو کر قلعے سے نکلا۔ امیرالامراء (نجف خاں) بھی جو بازار میں انتظار کر رہا تھا سوار ہوا اور اپنے ہاتھی کو اُس کے ہاتھی کے ساتھ ساتھ لے کر اپنے گھر لے گیا اور وہاں نگرانی میں رکھا۔ چند دن تو لیت و لعل میں گزارے کہ آج بادشاہ کے پاس جاؤں گا، کل جاؤں گا، بعد میں کہہ دیا کہ: ''وہاں جا کے کیا کرو گے؟ بہتر یہی ہے کہ میرے پاس رہو۔'' لیکن اُس کے مال و منال میں دست اندازی نہیں کی۔ بیس رُپے روز اپنے پاس سے مقرر کر دیے اور چند خدمت گار اُس کے پاس چھوڑ دیے۔ خود بادشاہ کے ملکی و مالی معاملات میں لگ گیا۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ نہایت (بااختیار اور) بلند مرتبہ ہو گیا۔ اُس کے علوے مرتبت کے باعث لوگوں کی اتنی آمد و رفت رہتی تھی کہ امرا کو مجرے کا موقع بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جس دن وہ بادشاہ کے حضور میں آتا (اُسی دن) دربار ہوتا، ورنہ بادشاہ اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ پڑے رہتے تھے۔ لیکن وہ جوان تھا اور شاہ جہاں آباد

(دلّی) تو ایک طلسم خانہ ہے۔ یار دوستوں نے عیش و عشرت کی جانب مائل کر دیا۔ مکروہات کے استعمال اور عورتوں کی ہم جلیسی میں اتنا منہمک ہوا کہ بدن سے طاقت زائل ہو گئی۔ آخر مرضِ سل میں گرفتار ہو گیا۔ طبیبوں نے علاج میں بہتیرے ہاتھ پیر مارے لیکن:

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

جب (زندگی سے) مایوس ہو گیا تو بڑی حسرت سے کہتا تھا کہ: "میں کچھ نہیں چاہتا بس اتنی تمنا ہے کہ زندہ رہ جاؤں۔"

اُس کی بیماری میں زمانے کا رنگ اور بدلا:۔

میری دلی سے ہجرت

فقیر (میر) خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جاؤں مگر اسباب و وسائل کا فقدان قدم نہیں نکالنے دیتا تھا۔ (بارے) میری عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کو خیال آیا کہ میر میرے پاس نہیں آتا۔ نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نے جو اسحاق خاں نجم الدولہ کے چھوٹے بھائی اور وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے، اُن پرانے روابط پر نظر کر کے جو میرے (سوتیلے) ماموں (خان آرزو) سے تھے، کہا: "اگر نواب صاحب از راہِ عنایت زادِ راہ کے لیے کچھ مرحمت فرما دیں (تو) میر ضرور آ جائے گا۔" حکم ہوا کہ ایسا کیا جائے۔ اُنھوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے ایک خط لکھا کہ: "نواب والاجناب تمھیں طلب فرماتے ہیں۔ جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ۔" میں تو دل برداشتہ بیٹھا ہی تھا خط پاتے ہی لکھنو روانہ ہو گیا۔ چوں کہ خدا

کی امداد شاملِ حال تھی بغیر یار و مددگار اور قافلہ یا رہبر کے چند دنوں میں فرخ آباد سے گزرا۔

مظفر جنگ نے جو وہاں (فرخ آباد) کے رئیس تھے ہر چند چاہا کہ (میں) کچھ دن اُن کے ہاں ٹھہر جاؤں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ ایک دو دن بعد (وہاں سے) روانہ ہو کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ پہلے نواب سالار جنگ کے گھر گیا خدا اُنھیں سلامت رکھے، اُنھوں نے میری بڑی عزت کی اور میرے لیے ضروری چیزیں بندگانِ عالی (آصف الدولہ) سے کہہ کر بھجوا دیں۔

آصف الدولہ سے ملاقات

چار پانچ روز کے بعد اتفاقاً نوابِ عالی جناب مرغ لڑانے کے لیے تشریف لائے میں بھی وہاں موجود تھا، حاضرِ خدمت ہوا۔ فراست سے تاڑ لیا اور فرمانے لگے "میر محمد تقی ہو؟"۔ (پھر) بڑی عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ اپنی نشست گاہ پر لے گئے اور مجھے مخاطب کر کے اپنے اشعار سُنائے۔ میں نے کہا: "سبحان اللہ، بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے"۔ فرطِ مہربانی سے مجھے بھی شعر خوانی کا موقع دیا۔ اُس روز میں نے غزل کے چند شعر کہے۔ جب نواب صاحب اُٹھ کر جانے لگے تو نواب سالار جنگ سے کہا کہ: "میر حسب الطلب آئے ہیں اور اب بندگانِ عالی مختار ہیں انھیں کوئی جگہ عنایت فرمائیں، اور جب مرضی مبارک ہو خدمت میں بلوا بھیجیں"۔ (نواب آصف الدولہ نے) فرمایا: "میں کچھ (تن خواہ) مقرر کر کے تمھارے پاس بھیج دوں گا"۔ دو تین دن بعد یاد فرمایا تو میں حاضر ہوا اور مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ سُنایا۔ سماعت فرمایا

اور بڑی عنایت سے اپنے ملازموں کی صف میں مجھے داخل کر لیا اور (اب تک) میرے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے ہیں۔

نجف خاں کی وفات میرے اِدھر آنے کے بعد نجف خاں جو وہاں بیمار پڑا تھا، مر گیا[1]۔ اور شاہی کاروبار درہم برہم ہو گیا۔ اُس کے ملازمین مثل نجف قلی خاں و افراسیاب خاں اور دوسرے سردار اپنی اپنی جگہ سرکشی کرنے لگے، کچھ دن یہ کھینچا تانی رہی۔ آخر مرزا شفیع جو اُس کے بھائیوں میں سے تھا اور سکھوں کا زور توڑنے میں مصروف تھا، بادشاہ کی طلبی پر حاضر ہوا۔ اور عبدالاحد خاں کو اپنا چچا جتا کر قید سے رہا کر دیا، دیوانی خالصہ اُسے دلا دی اور خود مسندِ ریاست پر متمکن ہو گیا۔

(سانحہ) چوں کہ (مرزا شفیع) بہت سفاک و جرار تھا اس لیے ہر شخص اُس سے خطرہ محسوس کرتا تھا۔ وہ نجف خاں کے ملازموں کی سرکشی سے بھنا گیا اور شہر ہی میں جنگ شروع کر کے نجف قلی خاں کو گرفتار کر لیا۔ افراسیاب خاں (بھی) آکر نواحِ شہر میں مرزا مذکور (مرزا شفیع) سے مل گیا۔ لیکن اُس شخص (مرزا شفیع) کا عروج دیرپا ثابت نہ ہوا۔ کچھ دن بھی نہ گزرے تھے کہ لطافت نامی خواجہ سرائے جو وزیرالممالک کی طرف سے حضور (شاہ) میں رہتا تھا، اور سمرو فرنگی کے رشتہ داروں میں سے ایک فرنگی نے باہم سازش کی۔ جب اُسے دیکھتے پہلو بدلنے لگتے۔ بادشاہ کو بھی فہمائش کی کہ یہ شخص بے تمیز ہے۔ جب اُسے اپنے خلاف سازش کا علم ہوا تو صبر نہ ہو سکا، شہر سے نکل گیا اور عبدالاحد خاں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ (اُس کے فرار ہونے کی)

---

[1] ذوالفقار الدولہ نجف خاں ۲۲ اپریل ۱۷۸۲ء کو لاولد فوت ہوا تھا۔

جب اُنھیں خبر ہوئی تو بہتیرا تلاش کیا مگر کوئی نشان نہ ملا۔ بادشاہ نے شہر و اطراف کے لوگوں کو خطوط لکھے کہ جہاں بھی اُسے دیکھ پائیں ہرگز نہ چھوڑیں اور حضور (شاہ) میں لے آئیں۔ ایک تحریر بلم گڈھ کے سردار کو بھی پہنچی اور اتفاقاً یہ (مرزا شفیع) وہاں جاکر ٹھہر گیا تھا۔ قلعے کے سردار نے اُسے بادشاہ کی تحریر دکھائی تو بہت سراسیمہ ہوا۔ اور عبدالاحد خاں کو وہیں چھوڑ کر خود بھاگ گیا، ایک دو منزل آگے جاکر دم لیا۔ اور احمد بیگ ہمدانی سے جس کا آگرے پر تسلط تھا عہد و پیمان کر کے اُسے بادشاہ کے رفیقوں سے جنگ کرنے پر آمادہ کر لیا اور بیس ہزار فوج لے کر اُس کے ساتھ روانہ ہوا۔ یہاں وہ فرنگی، خواجہ سرا اور (بادشاہ کے) دوسرے عزیز بادشاہ کو لے کر شہر سے نکلے اور دریائے (جمنا) کے کنارے خیمے ڈال دیے۔ وہ اس کے کینے سے بے خبر تھے کہ وہ صرف قتل کرنے تک ساتھ ہے، بڑے طنطنے کے ساتھ قریب پہنچے۔ بادشاہ نے جب دیکھا کہ اُس کا کام بن گیا تو لطافت علی خاں خواجہ سرا اور فرنگی کو اُس کے پاس بھیجا۔ اُنھوں نے لپک کر خواجہ سرا کو گرفتار کر لیا اور فرنگی کو مار ڈالا۔ بادشاہ نے بڑی جرأت کے ساتھ اپنی حفاظت کی اور اُن کا مکر و فریب نہ چل سکا۔ اب اُنھوں نے جواب سوال شروع کیے اور بہت سے لوگوں کو وعدے وعید دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ جب یہ سمجھ لیا کہ بادشاہ بغیر لڑائی کیے قابو میں نہیں آئے گا تو عبدالاحد خاں کو بیچ میں ڈالا اور قول و قسم کیے اپنی بندگی اور رسوخ کا اظہار کر کے اُسے خیمے سے قلعے میں لے آئے۔ نجف قلی خاں، افراسیاب خاں، اور عبدالاحد خاں نے متحد ہو کر سلطنت کے معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لیے، اور ہمدانی کو جس کا مرزا شفیع سے وعدہ وعید ہو چکا تھا یوں ہی ٹرخا دیا۔ وہ چند

تو میں اور رہکلہ لے کر اکبر آباد کو روانہ ہو گیا۔ یہاں چند دنوں کے بعد افراسیاب خاں اپنے محالات میں گیا۔ اور مرزا مذکور نے شہر میں نجف قلی خاں سے جنگ کر کے اُسے گرفتار کر لیا۔ اور بیگم کے پاس جو نجف خاں کی بہن ہوتی ہے، بھیج دیا۔ عبدالاحد خاں اپنے گھر سے نکلا۔ اور چرب زبانی سے اپنا اُلّو پھر سیدھا کر لیا۔ بیگم مذکور نے سفارش کر کے نجف قلی خاں کو رہا کرا دیا۔ رفتہ رفتہ مرزا شفیع کا تسلط خوب ہو گیا۔ اور وہ شہر سے باہر نکل کر ملک گیری کی طرف متوجہ ہوا، چوں کہ کوئی بھی اُس سے مطمئن نہ تھا، افراسیاب نے آکر ہمدانی کو بلایا اور یہ طے کیا مرزا (شفیع) ہمدانی کی دلدہی کے لیے اُس کے خیمے تک آئے۔ چناں چہ اُسے وہاں لائے اور جھانسا دے کر اُسے قتل کر دیا۔ وہ مارا گیا تو افراسیاب خاں کا طوطی بولنے لگا اور ریاست کا انتظام اُس کے سپرد ہوا۔ ہمدانی پھر اپنے علاقے میں چلا گیا۔ اور یہ بادشاہ کے دربار میں امیرالامرا ہو کر باشاہی کاموں کا مختار بن بیٹھا۔

گورنر کا لکھنؤ میں استقبال

(سانحہ) اِدھر وزیر اعظم امیر معظّم گورنر بہادر کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے، جو اُن کی دعوت پر آرہے تھے اور اس وقت تمام ملک میں وہ قوی اور غالب ہیں ۔۔ فوج کا غبار آسمان تک پہنچ رہا تھا یہ سفر الٰہ آباد تک ہوا۔ اُس ضلع کے تمام سردار اُن کی آمد سے آگاہ ہو کر ملاقات کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک منزل پہلے نواب گردوں رکاب سے ملاقات ہوئی وہاں سے اپنے ساتھ لکھنؤ لائے جو سلطنت کا صدر مقام ہے۔ ہر منزل پر نئی نئی ضیافت ہوتی تھی: نئے نئے خیمے، عجیب و غریب کھانے۔ ترکی و تازی گھوڑے، کوہ پیکر ہاتھی، قیمتی پوشاک، اور جواہر کی کشتیاں،

خوشگوار شربت اَن گنت میوے، اِس علاقے کے اچھے تحفے، جنوب اور مغرب کی (بنی ہوئی) تلواریں، چاچی کمانیں (ہر جگہ بہار دکھا رہی تھیں) مجب لکھنؤ میں آئے اور محل میں اقامت فرما ہوئے (تو) ہر روز زرنگار رنگ کے فرش فروش، جن پر اعلیٰ درجے کا کام کیا ہوا، مکان کے کونوں میں گلاب چھڑکا ہوا، نرم و ملایم بستر خواب، معطر و معنبر لباس، مخمل کے اچھوتے فرش، سیم گل کی ہوئی دیواریں، پردوں اور جھالروں سے آراستہ ایوان، عنبر کی خوشبو عجب مستی آفریں تھی۔ بھُنے ہوئے پستے اور بادام اور انگریزی چیزیں، نُقل کے لیے رکھی ہوئی۔ راتوں کو حسین و جمیل عورتوں کا رقص ہوتا، بلکہ وہ (رقاصائیں) بہشت کی حوروں سے زیادہ دلکش تھیں۔ شیشے اور چینی کے گلدان سلیقے سے چُنے ہوئے تھے۔ تمام طاق تازہ میووں سے بھرے تھے۔ فرنگی رقص (ہو رہا تھا) عجب تماشا تھا، عجب مکان تھا، عجب ہوا تھی۔ شام کو چراغاں ہوا آتش بازی لائی گئی۔ "ستارہ" اور "ہوائی" آسمان تک پہنچ رہی تھیں۔ چراغاں کا نظارہ دل کو لبھا رہا تھا اور مہتابی سے رات روزِ روشن کا نمونہ بن گئی تھی۔ زربفت کا سائبان اِس خوبی سے کھینچا گیا تھا کہ سورج کی نگاہوں نے اُس کا جواب نہ دیکھا ہوگا! تمام اُمرا خاطر میں لگے ہوئے، راجا خدمت پر آمادہ، اچھے اچھے شعرا مدح خوانی کر رہے تھے۔ خوش منظر جوان (تھے)، ہر جگہ خوب سایہ پھیلا ہوا۔ پانی (کے فوارے) بہتے ہوئے۔ نرگس دان برابر رکھے (تھے)۔ جیسے پائیں باغ (آراستہ ہو) اور برف ایسی (بہہ رہی تھی)، گویا پگھلی ہوئی چاندی ہے۔ طرح طرح کے خوش رنگ شربت، قسم قسم کی بنی ہوئی روٹیاں (تھیں)، نانِ بادام بڑی نزاکت سے (بنی ہوئی) شیرمال

اور باقرخانی، خورشید کی مثل (صاف اور گرم)، نانِ جوان ایسی کہ (واقعی) بوڑھا کھائے تو جوان ہو جائے۔ نانِ ورقی کی تعریف کر دوں تو دفتر بھر جائے۔ نانِ زنجبیلی کو دیکھ کر ذائقہ محظوظ (ہوتا تھا)، ہر نوع کے قلیے، دو پیازے رکھے تھے کہ تمام مہمانوں کا جی للچا رہا تھا، کئی قسم کے کباب دسترخوان پر حاضر تھے۔ "کباب گل" اپنی تازگی اور خوبی میں (لاجواب) اور خوش ذائقہ کباب ہندی دل موہ لے رہا تھا، کبابِ قندھاری اپنی طرف مائل کر رہا تھا (تو) کبابِ سنگ ایسے کہ رات کے تھکے ماندوں کو بشاش کر دیں۔ کبابِ ورقی نہ جانے کس ترکیب سے تلے گئے تھے کہ طبیعتوں کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ یہ سب کباب بہت ہی خوش ذائقہ اور لذیذ تھے، (ایک ایک کھانے کی) دس دس قابیں رکھی ہوئی تھیں اور ہر ایک (مہمان) کے سامنے طرح طرح کے پلاؤ، شوربے (اور کھانے چُنے گئے) تھے۔ سبحان ذی الجود والکرام۔

یہ مہمان اور وہ میزبان!

(غرض) ایسی شان و شوکت کا مہمان اور نواب وزیر جیسا میزبان، ایسی آن بان کا مہمان اور ایسی ثروت کا میزبان، ایسے حسنِ اخلاق والا مہمان اور ایسی بڑی ریاست والا میزبان، ایسی خوبی اور خوش معاشی کا (مالک) مہمان اور ایسا سورج کی طرح زرپاش میزبان، ایسی عقلِ کامل والا مہمان اور ایسے الطاف کا میزبان، زمانے کی آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ اور نہ عاقلوں کے کانوں نے سُنا۔ اسی طرح چھ مہینے تک رات دن گفت و شنید رہی اور باہم صلاح مشورے ہوتے رہے۔

فرنگی سے گٹھ جوڑ

جب یہ خبر (بادشاہ کے) حضور میں پہنچی، وہاں کے امیروں میں سے ہر ایک اپنی فکر میں پڑ گیا۔ عبدالاحد خاں نے اپنے آدمیوں کو اُدھر روانہ کیا۔ اور فرنگیوں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ افراسیاب خاں وغیرہ کو اندیشہ ہوا کہ فرنگی اِدھر بھی آجائے گا، چوں کہ زبردست ہے بادشاہ کو اپنے قبضے میں کر کے ہمارا پتّا صاف کر دے گا۔ بہتر یہ ہے کہ (ہم) بادشاہ کو آگرے لے جائیں وہاں فوج جمع کریں اور مرہٹے کو، جو کوہ والا کی رانائی پر قابض ہے، اپنے ساتھ ملالیں پھر فرنگی سے نامہ و پیغام کریں۔ اگر جنگ کی نوبت آتی ہے تو آجائے ورنہ اسی ٹھاٹھ باٹ سے وہاں رہیں۔ چناں چہ بادشاہ کو (دلّی سے) نکال لیا (اور) اکبرآباد (آگرہ) چلے گئے اور راستے میں عبدالاحد خاں کو قید کر لیا۔

شہزادہ جواں بخت

(سانحہ) جب (یہ لوگ) شہر مذکور میں پہنچے (تو) شہزادہ جواں بخت وہاں سے بھاگ کر نواب وزیر (آصف الدولہ) اور فرنگی کے پاس آگیا۔ (اُنھوں نے) مضطرب ہو کر مرہٹے سے عہد و پیمان کیے۔ وہ اُن کا جانب دار ہو گیا (اب یہ) شہزادے کو واپس کرنے کی گفت و شنید کرنے لگے۔ یہاں فرنگی (انھیں) آئے بالے بتاتا رہا کیوں کہ اُسے اپنے ملک یعنی کلکتہ کا انتظام مدِ نظر تھا۔

کچھ دن کے بعد شہزادے کو ساتھ لے کر وزیر الممالک سے رخصت ہوا، اور چلا گیا۔ رخصت ہوتے وقت نواب والا جناب کے ملازموں کو بے حساب انعام اور بخشش سے سرفراز کیا جو قیاس میں بھی نہیں آسکتی، ہر (سردار) کو گھوڑا، ہاتھی اور قبا (عطا کی) اور ہر بے حیثیت کو خلعت بخشی۔

افراسیاب خاں کا قتل

جب صاحب دریا کے راستے سے چلے گئے اور نواب وزیر اپنے دار القرار (لکھنؤ) میں آ گئے تو مرہٹہ اور افراسیاب خاں نے محمد بیگ ہمدانی سے پرخاش کا ارادہ کیا، اُس نے بھی مونچھ نیچی نہیں کی۔ اور اِن سے بھڑنے کو آمادہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں میر زین العابدین برادر مرزا شفیع کے آدمی نے افراسیاب خاں کے خنجر گھونپ دیا۔ (جس سے) وہ دو چار دن کے بعد مر گیا۔ اِن دِنوں حضورِ شاہ میں کوئی سردار نہیں ہے۔ (اور) بادشاہ (بالکل) بے زور ہے، غالب (قیاس) یہ ہے کہ مرہٹے کا دور دورہ ہو جائے گا ــــــــ اِن سانحوں کے بعد مرہٹہ اور احمد بیگ ہمدانی کی فوجوں میں جھڑپ ہوئی جب اُس پر غلبہ نہ پا سکے تو (کوئی) بہانہ کر کے ہمدانی مذکور کو تیار کر لیا۔ اِدھر صاحب (انگریز) نے جو شہزادہ (جواں بخت) کو اپنے ساتھ لے گیا تھا، (اُسے) اجازت دے دی۔ چناں چہ اب شہزادہ واپس آ گیا ہے، (اب) یا تو اطراف میں (کہیں) رہیں گے یا بادشاہ کے حضور میں پہنچ جائیں گے۔ فی الحال تو نواب عالی جناب کے سائے میں گزار رہے ہیں اور جو مشورہ (نواب وزیر) دیتے ہیں اُسے قبول کر رہے ہیں۔

شکار نامے

یہاں فقیر (میرؔ) نواب صاحب (آصف الدولہ) کے ساتھ ہے اور اُن کی دُعا گوئی میں زندگی بسر کر رہا ہے، بندگانِ عالی شکار کے لیے بہرائچ تک گئے تھے۔ میں بھی ہم رکاب تھا۔ ایک شکار نامہ موزوں کیا۔ دوبارہ پھر شکار کے لیے سوار ہوئے اور کوہِ شمالی (ہمالیہ) کے دامن تک تشریف لے گئے۔ اگرچہ لوگوں نے اِس دور دراز کے سفر اور اُس کے نشیب و فراز میں بڑی

زحمتیں اُٹھائیں لیکن اُنھوں نے ایسی فضا، ایسی ہوا، اور ایسا شکار کبھی نہ دیکھا تھا۔ تین مہینے کے بعد اپنے دار القرار (لکھنؤ) میں آئے۔ فقیر (میرؔ) نے دوسرا شکار نامہ موزوں کر کے حضور میں پیش کیا۔ (نواب صاحب نے) شکار نامے کی غزلوں میں سے دو غزلیں انتخاب فرمائیں۔ بنفس نفیس اُن پر مخمس لکھا، اور خوب لکھا، جو غزل پسند ہوئی اُس میں دوسری غزل لکھنے کی فرمایش کی، خدا کے فضل سے وہ بھی موزوں ہو گئی، زبانِ مبارک سے تعریف فرمائی اور سخن وری کی داد دی۔

اِن دنوں تبدیلِ آب و ہوا کے باعث عشرۂ محرم الحرام کے بعد مزاجِ مبارک ناساز ہو گیا۔ علاج کیا گیا لیکن بیماری نے بہ نصیبِ اعدا طول کھینچا، ایک عالم خیرات و صدقات سے بہرہ اندوز ہوا، اور ہر شخص نے صحت کے لیے دعا کی، (بارے) حکیم مطلق و شافیٔ برحق نے شفا دی، ہم پر اور مخلوق پر احسان کیا ع:

الٰہی تا جہاں باشد تو باشی

مرہٹوں کا تسلط

چوں کہ بادشاہ کے حضور میں نجف خاں کے آدمیوں میں سے جو برسرِ اقتدار تھے (اُن میں سے) کوئی باقی نہیں رہا، مرہٹے جو قریب ہی تھے، حاوی آ گئے اور مختار بن کر دندنانے لگے۔ بادشاہ نے تمام اختیارات مرہٹے کو سونپ دیے اور نجف خاں کے آدمیوں کا زور ختم ہو گیا۔ (اب) اکثر معاملات میں مرہٹے ہی سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ اور تمام امور اُسی کی منشا کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ مرہٹے کی فوج بھی شاہ جہاں آباد پہنچ گئی اور مشہور ہے کہ اُس نے (پوری طرح) قبضہ جما لیا ہے۔ سکھ جو شہر کے آس پاس لوٹ مچا رہے تھے اب وہ بھی مغلوب ہو گئے ہیں کیوں کہ وہ دکھنیوں سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ اور اِن لوگوں کے طریقہ جنگ

کو نہیں پہنچ سکتے۔ بادشاہ (جو شہر اکبر آباد (آگرہ) کے باہر خیمہ زن تھا۔ چند دن کے بعد دلّی کو روانہ ہو گیا۔ اور عبدالاحد خاں کو قید کر کے علی گڑھ بھیج دیا، جو نجف خاں کی بہن کے قبضے میں ہے۔ اور نجف خاں کے بہت سے آدمی وہاں کے قلعے میں جمع ہیں۔ (اب) مرہٹہ مالک الملک ہے جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ بادشاہ کو دست برداشتہ کچھ دے دیتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اُسے لے جاتا ہے۔ چناں چہ شہر میں ایک مہینے رہا اور (پھر) علی گڑھ لے گیا، دس پندرہ دن تک جنگ ہوتی رہی، آخر عہد و پیمان کر کے بیگم کو (قلعے سے) نکالا۔ اُس سے نجف خاں کے اموال میں سے کچھ حاصل کر کے اُسے چھوڑ دیا۔

وہاں سے بادشاہ کو راجپوتوں پر چڑھا کر لے گیا۔ اُنھوں نے مقاومت کی، کچھ دنوں کے بعد راجپوتوں سے صلح کر کے بادشاہ شہر دلّی میں آگیا اور مرہٹہ شہر اکبر آباد میں رہ گیا۔ لیکن راجپوتوں (پر حملہ کرنے) کی فکر میں تھا، دوبارہ چڑھائی کر کے اُدھر پہنچا۔ راجپوت راجاؤں نے ہمدانی کو بُلا کر جو نجف خانی سردار تھا، اپنے ساتھ ملا لیا۔ جنگ شروع ہوئی ہمدانی نے جرأت کا مظاہرہ کیا اور (لڑتا ہوا) مارا گیا۔ سرداری اُس کی جگہ مرزا اسماعیل کو ملی جو (ہمدانی کا) بھانجا تھا۔ یہ بھی جگر داری سے لڑا اور مرہٹوں کو مار بھگایا، اُنھیں شکستِ فاحش ہوئی۔ مرہٹے کے اسبابِ جنگ اور آلاتِ حرب سارے چھین لیے، وہ اپنی جان بچا کر بھاگا اور آگرے آیا۔ یہاں بھی مرزا اسماعیل پہنچ گیا، اُسے شہر سے نکال کر خود قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے کی جنگ نے طول کھینچا، مرہٹے نے اپنا فائدہ دوسری طرف دیکھا۔ بادشاہ شہر سے نکل کر نجف قلی خاں کے پاس جو حصار کے قریب تھا، چلا گیا، وہاں بڑی بھاری جنگ ہوئی آخرالامر نجف قلی خاں

سے کچھ (زر و مال) لے کر شہر (واپس) آگیا۔

غلام قادر خاں

اِس دوران میں ضابطہ خاں کے لڑکے نے جس کا نام غلام قادر تھا۔ اور وہ اپنے باپ کے بعد سہارن پور وغیرہ پر قابض تھا۔ طاقت جمع کرلی۔ (وہ) سکھوں کی فوج کو ساتھ لے کر آیا، اور اکثر شاہی محلات جو دو آبے کے درمیان تھے ہتھیا لیے۔ قریب آکر بادشاہ سے کچھ طلب کیا، بادشاہ نے (کورا) جواب دے دیا۔ وہ دریا کے اُس طرف محاذ بنا کر جنگ کرنے پر آمادہ ہو گیا، اور ایک مہینہ یا کچھ زیادہ جنگ چلتی رہی۔ بادشاہ کے پاس اگرچہ فوج یا طاقت نہیں تھی تاہم وہ جی جان سے لڑا اور اس بلا کو دور کر دیا۔ (غلام قادر) وہاں اُٹھ کر اکبر آباد کے نواح تک قابض ہو گیا یہاں مرزا اسماعیل نے جو (آگرے کے) قلعے کا محاصرہ کیے پڑا تھا اُس کی کمان چڑھی دیکھی تو ساتھ مل گیا اور عہد و پیمان کیا کہ مرہٹوں سے ہم تم مل کے جنگ کریں گے۔ چند روز کے بعد مرہٹہ (مادھو راؤ سیندھیا) بھی یلغار کرتا ہوا آپہنچا جو چنبل کے پار جانے کی نیت سے آ رہا تھا۔ اُن دنوں یہاں شہزادہ صاحب عالم موجود تھا لیکن اُس نے تغافل کیا اور جنگ تنہا مرزا اسماعیل کے سر آپڑی اُس نے بڑی جواں مردی سے مقابلہ کیا اور اُس میدان کو بھی مار لیا۔ مرہٹہ بھاگ کر گوالیار کی طرف چلا گیا جو اُس کے قبضے میں تھا۔ کچھ دنوں کے بعد دوسری فوج جمع کر کے لڑنے کے لیے آیا۔ دس پندرہ روز تک اکبر آباد کے اطراف میں جنگ ہوئی آخر مرزا اسماعیل کو شکست ہوئی۔ غلام قادر خاں تماشا دیکھتا رہا۔ مرزا مذکور بھاگ کر غلام قادر خاں کے پاس گیا۔ لیکن دیکھا کہ یہ اپنی ہی فکر میں لگا ہوا ہے اور میری مدد کرنا نہیں چاہتا مجبوراً اُس کے پاس کچھ دنوں رہا پھر اپنے ملک کی طرف چلا گیا۔

غلام قادر خاں کے مظالم

بادشاہ کے ناظر نے غلام قادر خاں کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا، اُسے لکھا کہ تم یہاں آجاؤ بادشاہ میرا کہنا نہیں مانتا یعنی مرہٹوں کی طرف داری سے باز نہیں آتا۔ یہ دونوں شہر میں گئے۔ بادشاہ خود کچھ طاقت نہیں رکھتا تھا۔ ناظر نمک حرام کے مشورے سے قلعے کا بندوبست اپنے ہاتھوں میں لے کر بادشاہ کو علیٰحدہ کر دیا۔ اُس کے ساتھ ناگفتہ بہ سلوک کیا۔ اور تمام قلعے کو غارت کر دیا۔ اور شہزادوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیئے تھا۔ بہت سا زر و مال اُس کے ہاتھ آیا۔ بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں اور دوسرا بادشاہ بنا دیا۔ جب پوری طرح تسلط حاصل کر لیا تو ناظر کو بھی قید کر دیا۔ اور شہر والوں کو بھی پریشان کرنا شروع کیا۔ جب اُس کا غلبہ حد سے بڑھ گیا تو کسی بات پر مرزا اسماعیل سے ٹھن گئی۔ اور اُسے کچھ دینے میں کوتاہی کی اُس عزیز نے مرہٹے سے صلح کر لی۔ اِسی دوران میں مرہٹے کی فوج قریب پہنچ گئی اور (اُس کے) سرداروں میں سے بعض شہر میں داخل ہو گئے۔ (غلام قادر) روہیلہ قلعہ بند ہو گیا۔ رات کے وقت مع فوج و اسباب اور زر و مال نیز شاہزادوں اور ناظر اور اُس کے دوسرے متعلقین کو ساتھ لے کر خضری دروازے سے نکل بھاگا۔ شاہدرے کے قریب اپنی فوجوں کو جما دیا آخر الامر مرہٹہ (مادھوراؤ سیندھیا) اُس کی بے حیائی دیکھ کر دریا کے پار گیا، اور جنگ شروع کر دی۔ کبھی یہ غالب آتے تھے کبھی وہ ملعون۔ جب ایک مہینے کے قریب گزر گیا تو علی بہادر نامی ایک سردار دکھن سے آیا اور روہیلوں سے جنگ کرنے پر تُل گیا اور دو تین جھڑپوں کے بعد بڑی بہادری سے اسیر کر لیا۔ اور اُس کا مال و اسباب مع شاہزادوں کے اُس سے چھین کر اُسے قید میں رکھا۔ اور اُسی اندھے شاہ عالم کو بادشاہ مقرر کیا۔ قلعے کو جاٹوں کے

حوالے کر دیا۔ اب سو رُپے روز بادشاہ کو دیتے ہیں اور تمام ملک پر متصرّف ہیں۔ اُس ملعون (غلام قادر) کو بڑی ذِلّت کے ساتھ مار ڈالا۔ اب مرہٹہ (سیندھیا) بادشاہ ہے جو چاہتا ہے سو کرتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ یہ رنگ کب تک رہتا ہے۔

عبرت و خاتمہ

(القصّہ) دنیا عجب حادثہ گاہ ہے۔ کیسے کیسے مکان خراب ہو گئے اور کیسے کیسے جوان مر گئے، کیسے باغ تھے کہ ویران ہو گئے اور کیا محفلیں تھیں جو افسانہ ہو گئیں، کیسے کیسے پھول کمھلا گئے۔ کیا کیا لوگ گزر گئے، کیسی مجلسیں اُکھڑ گئیں کیسے کیسے قافلے کوچ کر گئے۔ عزیزوں نے کیا کیا خواریاں دیکھیں اور کیسے کیسے انسان جانوں کی بازی ہار گئے۔ اِن عبرت بین نگاہوں نے کیا کیا دیکھا اور اِن سُننے والے کانوں نے کیا کیا سُن لیا!

ہر کاسۂ سرز افسرے می گوید
ہر کہنہ خرابہ از درے می گوید
دنیاست فسانہ، پارۂ ما گفتیم
واں پارہ کہ ماند دیگرے می گوید [1]

اِس تھوڑی سی مدّت میں اِس ایک قطرہ خون نے جسے دِل کہتے ہیں طرح طرح کے ستم جھیلے اور تمام خون ہو گیا ہے، میرا مزاج ناساز تھا، ہر شخص سے مِلنا جلنا چھوڑ دیا، اب بڑھاپا آ گیا ہے یعنی عمرِ عزیز ساٹھ سال کی ہو چکی ہے اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں کچھ دن آنکھوں کی تکلیف میں مبتلا رہا۔ بینائی کمزور ہو گئی اور عینک کی ضرورت پڑی میں نے کفِ افسوس

---

[1] (مطلب) ہر کاسہ سر تاج سے کہہ رہا ہے اور ہر اجرا ہوا مکان در سے یوں گویا ہے کہ یہ دنیا تو ایک فسانہ ہے جس کا کچھ حصہ ہم نے بیان کیا اور جو باقی رہ گیا اب وہ کوئی اور بیان کرے گا۔ (ن۔ا۔ف)

ملے اور اس شعر کو یاد کرکے ذوقِ نظر چھوڑ دیا کہ :-

دیدہ چوں محتاجِ عینک گشت فکرِ خویش کن [1] برنفس دارند روزِ واپسیں آئینہ را

اور دانتوں کے درد کی بات کیا کہوں، حیران تھا کہ کب تک علاج کروں آخر مجبور ہو کر ایک ایک دانت جڑ سے اکھڑوا دیا۔

روزی خود را برنج از دردِ دنداں می خورم [2] ناں بخوں تر می شود تا پارۂ ناں خورم

غرض کہ ضعفِ قویٰ، بے دماغی، ناتوانی، دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بہت دن نہ جیوں گا، زمانہ بھی (زندہ) رہنے کے لائق نہیں رہا ہے اب اس سے دامن کھینچ لینا ہی اچھا ہے۔ اگر خاتمہ بخیر ہو جائے تو یہی آرزو ہے ورنہ اختیار تو اسی (ذاتِ بے ہمتا) کے ہاتھ ہے!

---

[1] (مطلب) آنکھیں جب عینک کی محتاج ہو جائیں تو اپنی (عاقبت کی) فکر کرے کیوں کہ عالمِ نزع ہی میں سانس کے قریب آئینہ رکھا جاتا ہے۔

[2] (مطلب) میں اپنی روزی بڑی تکلیف کے ساتھ کھاتا ہوں۔ کیوں کہ دانتوں کے درد کی وجہ سے روٹی خون میں تر ہو جاتی ہے تب کہیں ایک ٹکڑا حلق سے نیچے اترتا ہے۔ (ن۔ا۔ف)